خطباتِ نظامی

علامہ مشتاق احمد نظامی

روحانی پبلشرز

خطباتِ نظامی

خطیبِ مشرق

علامہ مشتاق احمد نظامی

بانی آل انڈیا سُنّی تبلیغی جماعت و ادارہ شرعیہ بہار اشرف
و دارالعلوم غریب نواز الٰہ آباد

ناشر
روحانی پبلشرز نورانی مسجد مین بازار
شام نگر چوبرجی لاہور

نام کتاب	----------	خطبات نظامی
نام مولف	----------	علامہ مشتاق احمد نظامی
تاریخ طباعت	----------	ربیع الاخر ۱۴۱۴ھ
معاون خصوصی	----------	علامہ غلام رسول رضوی
ناشر	----------	محمد عبدالعزیز مخدوم
ہدیہ	----------	روپے

واحد تقسیم کار

مکتبہ نوریہ رضویہ

۱۱- گنج بخش روڈ لاہور فون ۲۱۳۱۹۱

مکتبہ غوثیہ

جامعہ حنفیہ غوثیہ شیراکوٹ بند روڈ لاہور

فہرست

عرض ناشر

الحمد للہ روحانی پبلشرز ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ادارہ ہذا کی یہ کوشش ہے اور رہے گی کہ قارئین کو علمی' ادبی اور روحانی کتب سے روشناس کرایا جائے۔ قبل ازیں ادارہ نے عملیات کی عظیم کتاب شمع شبستان رضا کی تصحیح کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کی۔ اب دنیائے ادب کے مایہ ناز شاہ سوار علامہ مشتاق احمد نظامی کی علمی اور ادبی روحانی کتاب "خطبات نظامی" قارئین اکرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہے جو کہ علماء' ادباء' سکالرز' صحافی طلبہ کیلئے یکساں مفید ہے۔

آخر میں میں اپنے کرم فرما بزرگ حضرت علامہ محمد غلام رسول رضوی کا ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے کتاب ہذا کی اشاعت و طباعت میں خصوصی تعاون فرمایا۔

پیش گفتار

خطابت بحیثیت فن کوئی آج کی ایجاد نہیں ہے۔ پہلے بھی اس فن نے جادو جگائے ہیں، فسوں کاریاں کی ہیں۔ پہلے بھی اس فن کی مدد سے بڑے بڑے میدان سر کئے گئے ہیں سست نہاد اور دون ہمت لوگوں نے جب بھی جہدِ عمل سے پہلوتہی کی ہے اور اپنی بے پرو بالی، اپنے ضعف اور اپنی بیچارگی کو بہت نہ بنایا ہے تو زور خطابت ہی نے ان کا لہو گرمایا ہے، ان میں جوش و ولولہ پیدا کیا ہے اور ان کی رگوں میں بجلیاں بھردی ہیں۔ پھر یہی ضعف و ناتوانی کا عذر لنگ پیش کرنے والے آندھیوں سے بھی لڑ گئے ہیں، بجلیوں سے بھی آنکھیں لڑائی ہیں، اور طوفانوں سے بھی مقابلہ کیا ہے۔ آج بھی اپنی جماعت میں ایسے ایسے جادو بیان اور سیف زبان خطیب موجود ہیں۔ کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی جادو بیانی سے پتھر کے جگر میں بھی شگاف کردیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ان یکّہ تازان عرصۂ خطابت میں علامہ نظامی صاحب ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کی اپنی ایک الگ حیثیت ہے۔ وہ اپنی کہنگی اور پیرانہ سالی کے باوجود آج بھی شہرستانِ خطابت کے شہریار ہیں۔ کشورِ خطابت میں آج بھی ان ہی کا سکہ چلتا ہے۔ چنانچہ جس نے بھی علامہ نظامی کو سنا یا پڑھا ہے وہ ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ اپنی جماعت میں علامہ نظامی ہی وہ

پہلے شخص ہیں جنھوں نے خطابت کو نئی سمت عطا کی، نئی وسعتوں اور نئی پہنائیوں سے روشناس کیا۔ وقت کے ژولیدہ مسائل کا جتنا خوبصورت حل علامہ موصوف پیش کرتے ہیں۔ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ بڑے سے بڑے فلسفیانہ مباحث کو محاکاتی رنگ اور تمثیلی انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ کوئی نظامی صاحب سے سیکھے۔

ع کہاں سے لائے گا قاصد بیاں میرا زباں میری

یہ بات انتہائی مسرت کی ہے کہ اب ہماری جماعت میں شیریں مقال خطیبوں اور شعلہ نوا مقرروں کی کمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دینی واقفیت کے لئے خطبات یا تقریروں کے مختلف سیریز یا سیریلس بھی نہایت ارزاں قیمت پر ہر جگہ دستیاب ہیں لیکن مجھے کہنے دیجئے ؎

خدا معلوم کس نے کہہ دیا ہے کم سوادوں سے
کہ جو تیشہ اٹھا لیتا ہے وہ فرہاد ہوتا ہے

علامہ نظامی کی زمانہ کو آج بھی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ان کی تقریروں میں معنویت و مقصدیت کے علاوہ جو سلاست و روانی سادگی و پرکاری، برجستگی اور بے ساختگی ہے وہ اور جگہ کہاں؟ ڈھلے ڈھلائے الفاظ، ترشے ترشائے جملے، کوثر کی دھلی زبان کہاں پائیں گے دوسرے مقررین؟

یہ صحیح ہے کہ نظامی صاحب کو ایکٹنگ یا اداکاری نہیں آتی انھیں بننے سنورنے یا میک اپ کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں معلوم لیکن یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ جذبات کی جو کارفرمائیاں علامہ نظامی صاحب کے یہاں ہیں وہ اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ خلوص کی جو شدت

آپ یہاں پائیں گے اس کا ہر جگہ فقدان ہے۔ ان کے علاوہ عقیدہ و ایمان کی اصلاح و درستگی اور سنیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے علامہ نظامی جس طرح اپنا خونِ جگر پانی کر رہے ہیں اس کی داد نہ دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔

مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ میں "خطباتِ نظامی" کے لئے پیش گفتار لکھنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ حضرت علامہ سے متعلق پہلے جو میرا خیال تھا آج بھی وہی ہے۔ پہلے کبھی میں نے ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"نظامی صاحب کو اعلیٰ حضرت سے قلبی تعلق اور جذباتی وابستگی کی بنا پر ہی وہ ان کے مشن کو فروغ دینا اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں" علاوہ ازیں نظامی صاحب میں دینی خدمت کا جذبہ بھی اتنا شدید ہے کہ وہ تمام اقدارِ حیات کو مسلمان بنا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اسلام ان کے نزدیک وہی معتبر ہے جو بریلوی نقطۂ نگاہ رکھتا ہے اور جو صرف بریلوی مکتبۂ فکر کی آغوش میں پلتا ہے۔ چنانچہ اعمال و افعال کے لئے بھی وہی پیمانے ان کے نزدیک معتبر ہیں، جن پر بریلویت کی چھاپ ہو۔ فکر و نگاہ کے لئے بھی وہی زاویے قابلِ وثوق ہیں جن پر بریلی کی عینک چڑھی ہو۔

غرض ان کے نزدیک وہی سکہ رائج الوقت ہے جو بریلی اور صرف بریلی کی ٹکسال میں ڈھلتا ہے۔"

خطباتِ نظامی کے سلسلے میں بھی جو پیشین گوئی پہلے کر چکا ہوں آج بھی وہی دہرا رہا ہوں۔

خطباتِ نظامی میں شعلہ نوائیاں بھی قید ہوئی ہیں شیریں بیانیاں بھی۔ اس میں طنطنۂ خیال بھی منضبط ہوا ہے، زمزمۂ بیان بھی۔ ہمہمۂ خیال بھی ریکارڈ ہوا ہے لخلخۂ افکار بھی۔ غرض اس میں وہ تمام علمی موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں جو کبھی اسٹیج پر خطابت کی گھن گرج میں نظامی صاحب سے سنی گئی تھیں یا جواب تک نظامی صاحب کے حاشیۂ خیال میں محفوظ تھیں، ان سبھوں کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کر دیا گیا:

ع کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

خطباتِ نظامی سے متعلق جو بات نئی کہنے جا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ حضرت قبلہ گاہی زبان و بیان پر بھی بے انتہا قدرت رکھتے ہیں۔ وہ جب کسی واقعے کو پھیلانا چاہتے ہیں تو اس کی درازی معشوق کی زلفِ دراز سے بھی بڑھا دیتے ہیں، طولِ شبِ فراق سے بھی، حد یہ کہ فردائے قیامت سے بھی۔ لیکن جب کسی طول طویل واقعے کو مختصر کرنے پر آتے ہیں تو ہزاروں سال کے فاصلے کو سمیٹ کر ایک لمحے میں قید کر لیتے ہیں۔ قیامت جس کی درازی کو قرآن نے پچاس ہزار سال کی مسافت قرار دی ہے کان مقدارہ خمسین الف سنۃ لیکن یہی درازی خاصانِ خدا کے لئے سمٹ کر ایک لمحہ بن جاتی ہے۔ وما امر الساعۃ الا کلمح البصر

نظامی صاحب کی تقریر کا اعجاز کمال یہ ہے کہ وہ بھی طویل فاصلے کو مختصر کر کے لمحہ اور لمحہ کو پھیلا کر طویل بنا دیتے ہیں معراج

کے واقعے میں نظامی صاحب نے اسی تکنک سے کام لیا ہے۔ وہ معراج کا سفر مسجد حرام سے شروع کرتے ہیں مسجد اقصےٰ تک جانے کے بعد انھوں نے آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز دکھائی ہے۔ معراج کے دولھا فضاؤں سے گذرتے ہیں، خلاؤں سے گذرتے ہیں، پہنائے آسمان سے بھی گذر جاتے ہیں، پھر سدرۃ المنتہیٰ کی بیکراں وسعتوں سے بھی گذر کر عرش اعظم یعنی لامکاں کی بلندیوں پر پہنچتے ہیں۔ اتنی دور دراز مسافت کو نظامی صاحب تقریر کرتے ہوئے صرف ایک گھنٹے میں طے کرتے اور معراج کے دولھا سے متعلق تمام تفصیلات صرف ایک مصرع پر تمام کر ڈالتے ہیں:

؎ بمقامیکہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

یہ تو ہوئی سمندر کو قطرے میں سمونے کی مثال، لیکن اگر آپ قطرے کو سمندر بنتے دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر آقائے کائنات کی بشریت کے موضوع پر نظامی صاحب کی تقریر پڑھیے۔

آقائے کائنات کی بشریت تخلیق کے نقطۂ آغاز سے نقطۂ اختتام تک ہر جگہ کارفرما نظر آئے گی۔ حیات کو آپ اس کے گوناگوں مظاہر اور رنگارنگ جلوؤں کے ساتھ اس ایک وجود میں انجمن آرا پائیں گے۔ قبلہ نظامی صاحب کی تقریر آپ کو باور کرا دیگی کہ پوری کائنات حسن اپنی تمام جلوہ سامانیوں اور اپنی ساری دلنشیں اداؤں کے ساتھ اس ایک کالبد انسانی میں اتر آئی ہے۔ آقائے کائنات صحیفۂ ہستی کے حرف آغاز بھی ہیں، اور عنوان زیست کی سطر آخریں بھی۔

(آپ ہی راز خلقت ہستی بھی ہیں آپ ہی بہار صبح وجود بھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تخلیق کی غزل کے مطلع اولیں ہیں آپ نظامی

صاحب نے اسی ایک مطلع کی توضیح و تشریح میں ازل سے ابد تک کی دوری طے کی ہے۔

خطباتِ نظامی اپنی پوری ضخامت اور حجم کے ساتھ دراصل اسی ایک مطلع کی تشریح اور اسی ایک اجمال کی تفصیل ہے۔ نظامی صاحب کی تقریر جیسے جیسے آپ پڑھیں گے آپ کا شوق فزوں ہوتا جائے گا۔ منزل پر پہنچ کر بھی آپ قیام کرنا پسند نہیں کریں گے آپ کا ذوق تجسس ایک منزل سے دوسری منزل اور دوسری سے تیسری منزل تک پہنچنے کے لئے آپ کو رواں دواں رکھے گا۔ غرض آپ کو کسی مقام پر قرار نہیں آئے گا۔

نظامی صاحب بھی کسی مقام پر قرار نہیں پکڑتے۔ چلنا چلتے رہنا، مدام چلنا ان کی زندگی بن چکی ہے۔ چنانچہ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر بھی وہ سفر کرتے رہتے ہیں:

ط زہے روانیٔ عمریکہ درسفر گذرد

خطباتِ نظامی کی دوسری اہم خصوصیت اس کی منظر نگاری ہے۔ نظامی صاحب کو منظر نگاری اور مرقع کشی خوب آتی ہے۔ وہ مصوری بھی کر لیتے ہیں اور پیکر تراشی میں بھی انھوں نے مہارت بہم پہونچائی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں انھوں نے جمالیاتی کیفیات اور ماورائی حقائق کی منظر کشی اتنی خوبصورتی سے کی ہے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔

نظامی صاحب اپنی تقریروں میں تشبیہات سے بھی کام لیتے ہیں، بلکہ تشبیہیں ان کی تقریروں کی جان ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اشاروں کنایوں میں بھی بات کرنے کے عادی ہیں۔ اور تمثیل اور استعارے کی زبان میں تو ان کے بات کہنے

کا انداز سب سے اچھوتا ہے، سب سے نرالا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس کتاب میں جہاں جہاں کوئی دقیق بات آ گئی ہے وہاں وہاں انھوں نے تشبیہات کا ایسا چمن سجایا ہے اور تمثیلات کی ایسی گلکاری بلکہ بہار آرائی کی ہے کہ صفحے کا صفحہ گلکدۂ اِرم بن گیا ہے۔ آپ تقریر پڑھتے جائیں گے، آپ پر ایک کیفیت طاری ہوتی جائے گی۔ آپ عالم مستی میں جھومنے لگیں گے۔ نظامی صاحب کی یہی وہ فنکاری ہے جو انھیں عام مقررین سے ممتاز کرتی ہے۔

نظامی صاحب نے "روح اور روحانیت" کے موضوع پر جو تقریر قلم بند کی ہے وہ ان کی شاہکار تقریر، غیر فانی یادگار اور لازوال کارنامہ ہے۔

اس تقریر کا پس منظر یہ ہے کہ روح جب تک جسم سے متعلق رہتی ہے، ایک خوشبو ہے جو غنچے کی قید میں ہے، ایک صدا ہے جو پابند ساز ہے لیکن جیسے ہی قفس عنصری سے رہائی پا جاتی ہے اس کی نگاہوں سے سارے حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ اور وہ قید زمان و مکان سے آزاد ہو جاتی ہے۔ لیکن روحانیت ہر زمانہ میں رواں دواں ہے، تمام ممکنات پر اسے پہلے ہی سے دسترس ہے۔ اس کی پرواز سرحد ادراک سے بھی پرے ہے۔ اس کی جولانگاہ حد تعینات سے بھی آگے۔ چنانچہ ماضی و مستقبل بھی اس کے نزدیک کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے حال ہی حال ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ میں نے کسی کتاب میں کبھی پڑھا تھا کہ حضرت علی سہل اصفہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کسی نے پوچھا "عہد الست آپ کو یاد ہے"، انھوں نے جواب دیا "کیوں نہیں، کل ہی کی تو بات ہے۔"

اس گفتگو کا علم جب وقت کے امام عظیم المرتبت شیخ حضرت عبداللہ انصاری قدس سرہ کو ہوا تو انہوں نے فرمایا حضرت علی ابھی بچے ہیں۔ ان کے ذہن میں ابھی بالیدگی نہیں آئی ہے۔ صوفیوں کے نزدیک کل اور پرسوں کیا۔ صوفیوں کے یہاں جو کچھ ہے آج ہے۔ روز الست ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی اس دن کی شب بھی نہیں آئی۔ صوفیوں کے لئے ابھی وہی گھڑی ہے؛؛

پھر صاحب کتاب نے اس موقعہ پر جو دلیل دی ہے ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اسے رد کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

"آقائے کائنات نے معراج کے سفر میں حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھا تھا کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں ہیں۔ پھر ان کی ملاقات جنت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی تھی حضور نے ان سے پوچھا اے عبدالرحمٰن! تم نے یہاں آنے میں اتنی دیر کیوں کر دی؟ حضرت عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ! میں کوشش کے باوجود آپ تک نہیں پہنچ سکا۔ آپ کی جدائی میں ہمیں اتنی تکلیف پہنچی کہ ویسی تکلیف اگر بچوں کو ہو تو اس کے صدمے سے وہ بھی بوڑھے ہو جائیں؛؛

غور فرمائیے حضرت یونس علیہ السلام کے شکم ماہی میں بند کا زمانہ رسول پاک کے سفر معراج سے کئی ہزار برس پیش تر کا ہے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے جنت میں ملاقات وقوع قیامت کے بعد ہوگی۔ قیامت ابھی آئی نہیں۔ قیامت کے آنے میں ابھی دیر ہے۔ قیامت کا دن بھی پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن جنت میں تشریف لے جائیں گے۔ لیکن رسول پاک آج ہی حضرت یونس کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن کو بھی

یعنی ماضی پر بھی نظر ہے مستقبل پر بھی۔

صحیحین کی اس روایت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ صاحب روحانیت کے لئے ماضی مستقبل سب حال ہے۔

روح اور روحانیت کے موضوع پر نظامی صاحب کی یہ تقریر انھیں بہت دنوں تک زندہ رکھے گی اور اہلِ نظر نظامی صاحب کی پرداز فکر اور منتہائے نظر کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے اگرچہ مجھے اس کا بھی ڈر ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ تقریر مطلق پسند نہیں آئے گی وہ اس میں نقص ہی تلاش کریں گے۔ کیونکہ مکھیاں تمام جسم میں وہیں پر بیٹھتی ہیں جہاں زخم ہوتا ہے۔ اور جونک کی فطرت یہ ہے کہ وہ گائے یا بھینس کی تھنوں میں بھی لگے گی تو دودھ چوسنے کی بجائے خون ہی چوسے گی۔

نظامی صاحب نے جہاں ہزاروں نیازمند پیدا کئے ہیں وہیں ان کے حاسدین کی بھی ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے "خطباتِ نظامی" کی اشاعت سے ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل جائے گی ایسی صورت میں بھلا وہ کب چاہیں گے کہ ان کی اجارہ داری معرض خطر میں پڑے، ان کی سیادت و سربراہی کو آنچ آئے؟

روح اور روحانیت کے موضوع سے کچھ لوگ اس لئے بھی چیں بجبیں ہوں گے کہ وہ ارباب روحانیت کو پھوٹی آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ان اللہ والوں سے انھیں للّٰہی بغض ہے۔

"خطباتِ نظامی" اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ اور تقریر کے شائقین کے لئے ایک لازوال تحفہ ہے ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب فکر و نظر اور ذہن و شعور میں انقلاب برپا کرے گی۔ اور ایک صحت مند سنی لٹریچر کی حیثیت سے اُس کو

قبولِ عام حاصل ہو گا۔

نظامی صاحب اگر مجھے معاف کر دیں تو اس موقع پر ایک رازِ درونِ خانہ کا بھی انکشاف کر دوں۔

یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ان دنوں دینی درسگاہوں سے تحصیلِ علم کا شوق رخصت ہو گیا ہے اور طلباء و مدرسین دونوں ہی میں تقریر کی مشق بہم پہنچانے کا رواج دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اس کی وجہ میری سمجھ میں جو آتی ہے یہ ہے کہ مدارس کے معلمین کو اپنا سارا وقت تدریسی خدمات کے لئے وقف کرنا پڑتا ہے اور اس کا جو معاوضہ انھیں ملتا ہے وہ عام طور سے پانچ یا چھ سو روپے ہوتے ہیں۔ لیکن اتنی ہی رقم ایک مقرر صرف ایک گھنٹہ تقریر کر کے بطور نذرانہ وصول کر لیتا ہے۔ مرغ اور پلاؤ اوپر سے۔

وقت کی اس ستم ظریفی کو دیکھتے ہوئے ہر طالب علم میزان و منشعب پڑھنے کے زمانہ ہی سے تقریر کی مشق کرنے لگتا ہے اور اس ویڈیو کیسٹ اور ٹیپ ریکارڈر کے زمانے میں کسی کی تقریر حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں رہ گیا۔ چنانچہ دیکھا یہ گیا ہے کہ جب بھی دینی اجلاس یا کوئی کانفرنس وغیرہ انعقاد پذیر ہوتی ہے تو ایسے موقعے پر چھوٹے چھوٹے بچے اچھے مقررین کی تقریریں رٹ کر اسٹیج پر آجاتے ہیں اور اپنی گل افشانی گفتار سے مجمع کو متاثر کرتے اور ان سے بھر پور داد وصول کر لیا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں جو مقرر اسٹیج پر آتے ہیں ان کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ وہ خود بھی احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور مجمع بھی ان کی وہ پذیرائی نہیں کر پاتا جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ بستی یا بہرائچ کے کسی پروگرام میں میں حضرت

علامہ نظامی صاحب کے ساتھ تھا۔ جب تک وہ تقریر فرماتے رہے میں اسٹیج پر بیٹھا رہا۔ جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو میں چائے پینے کے خیال سے سامنے کی چائے کی دکان پر چلا گیا۔ میں چائے پیتا رہا اور لوگ نظامی صاحب کی تقریر پر تبصرہ کرتے رہے۔

"معلوم ہوا تھا کہ نظامی صاحب بڑے ناز نخرے کے بعد یہاں آرہے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بات مشتہر کی گئی تھی کہ مملکتِ خطابت کا تاجدار آرہا ہے، عرصۂ خطابت کا شہسوار آرہا ہے وہ آرہا ہے جس کی گرمیٔ گفتار سے پتھر کا جگر بھی پگھلتا ہے، جس کی جادو بیانی پانی میں بھی آگ لگا دیتی ہے۔ لیکن وہ آیا تو کیا آیا کوئی نئی بات تو اس نے کی نہیں۔ جو تقریر اس نے کی ہے بالکل یہی تقریر اسی لب و لہجہ کے ساتھ تو برسوں ترسول یہاں ایک طالبعلم کر گیا ہے۔ بلکہ اس کی تقریر میں جو کشش تھی حسن اور لطافت تھی۔ ان کی تقریر تو بالکل سپاٹ معلوم ہوتی ہے"

کسی فرصت کے اوقات میں جب میں نے اس واقعے کا ذکر حضرت علامہ سے کیا تو انھوں نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا اس قسم کا حادثہ تو اکثر پیش آتا ہے کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ میری ہی تقریر اسی اسٹیج پر نہایت دھڑلے سے کر جاتے ہیں جس پر خود میں ہوتا ہوں۔

میں نے ان سے پوچھا "جب ایسی صورت پیش آتی ہے تو آپ کے دل پر کیا گذرتی ہے؟"

فرمایا "میں یہ خیال کر کے اپنا جی خوش کر لیتا ہوں کہ صنعتِ لسانی کی بنیاد پر جو لوگ بھی اپنی عظمت کا تاج محل تعمیر کر رہے ہیں انھوں نے سنگ و خشت بھی میرے ہی یہاں سے لی ہے اور

سرخی چونا بھی میرے ہی مال گودام سے حاصل کیا ہے"۔ ؎

بیدلؔ آں شعلہ کہ در بزم چراغاں گرم است
یک حقیقت بہ ہزار آئینہ تاباں شدہ است

اس تمہید کے بعد مجھے کہنے دیجئے کہ "خطبات نظامی" کی اشاعت چاہے جس جذبے کے تحت عمل میں آئی ہو، ہم کم مائگان علم کو نظامی صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اپنی تقریروں کا مجموعہ شائع کر کے ہمارے لئے خطیب الاسلام، مفکر ملت اور خطیب الہند وغیرہ بننے کی راہ ہموار کر دی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے جہاں یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ نظامی صاحب ایک ژرف نگاہ مفکر ایک بالیدہ ذہن خطیب ہیں وہیں یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ نظامی صاحب ملت کے جوانوں کے لئے اپنے دل میں کتنا بے پناہ درد رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نظامی صاحب کا سایۂ عاطفت ہم نیازمندوں پر دراز تر فرمائے۔ آمین

ع قلم این جا رسید و سر بشکست

ضیاء جالوی۔
۳۰/ ۸۹/ ۶

خطبے کے بعد آغاز تقریر سے پہلے

- چمن میں پھول کا کھلنا تو کوئی بات نہیں
زہے وہ پھول جو گلشن بنا دے صحرا کو

- یہ ارض مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے
جنت بھی یہیں، مالک جنت بھی یہیں ہے

- طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

- تمہیں کالی گھٹا کا بھی نہیں پہچاننا آتا ! ! !
نشیمن سے دھواں اٹھتا ہے تم کہتے ہو ساون ہے

- جو شے تیری نگاہ سے گذرے درود پڑھ
ہر جزو کل ہے مظہر انوار مصطفےٰ

- اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی،
ہے شب گور اس گل سے ملاقات کی رات

- جب تک بکا نہ تھا کوئی پوچھتا نہ تھا
تم نے خرید کر مجھے انمول کر دیا

اے رضاؔ ہر کام کا اک وقت ہے
دل کو بھی آرام ہو ہی جائے گا

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

منظور ہے اس بزم میں اصلاحِ مفاسد
نشتر جو لگاتا ہے وہ دشمن نہیں ہوتا

نہ اِدھر اُدھر کی تو بات کر یہ بتا کہ قافلہ کیوں لٹا
مجھے رہزنوں سے غرض نہیں تیری رہبری کا سوال ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی !!
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا !!

عجب کچھ پھیر میں ہے سینہ و الاجیب و داماں کا
جو یہ ادھڑا تو وہ ٹانکا جو یہ ٹانکا تو وہ ادھڑا

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے
یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

وہ سجدہ تو سجدہ ہوا ہی نہیں
کہ سر جھک گیا دل جھکا ہی نہیں

وائے ناکامی زاہد کی جبیں پر
داغ سجدہ تو بنا داغ محبت نہ بنا

پہرے لگے ہوئے ہیں میرے عرض حال پر
میں لب کشا ہوں یہ ہے بڑی بات ان دنوں

نشیمن پر نشیمن اس قدر تعمیر کرتا جا
کہ بجلی گرتے گرتے آپ خود بیزار ہو جائے

پھول لے کر پھول آیا، پھول کر میں نے کہا
پھول لے کر کیا کریں گے تم تو خود ہی پھول ہو

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
میں جان گیا بس تیری پہچان یہی ہے،

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

نہ تیغ و تیر پہ تکیہ، نہ خنجر پہ نہ بھالے پر
بھروسہ تھا تو ایک سادہ سی کملی والے پر

دل کو تھاما، ان کا دامن تھام کے
ہاتھ اپنے دونوں نکلے کام کے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

ایسے کسی سائے میں سو جانے سے کیا حاصل
جب نیند ذرا ٹوٹے ہر خواب بکھر جائے

دار ہی مل گئی منصور کو عرش ورنہ،
کون دیتا ہے محبت کا صلہ دنیا میں

تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت!!
سب کچھ سہی مگر وہ تیرا آستاں نہیں،

۱ــــــ دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے

۲ــــــ اس بزم میں ہم سے کہتے ہیں موقع کے مطابق بات کرو
اور ہم نے یہ دل میں ٹھانی ہے یا دل کی کہیں یا کچھ نہ کہیں

۳ــــــ سو بار تیرا دامن ہاتھوں میں میرے آیا !
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

۴ــــــ اے جوشِ جنوں بیکار نہ رہ کچھ خاک اڑا ویرانے کی
دیوانہ تو بننا مشکل ہے صورت ہی بنا دیوانے کی

۵ــــــ ملنے کی یہی راہ نہ ملنے کی یہی راہ !!
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہ گذر ہے

۶ــــــ عشق کہتا ہے اس عالم سے جدا ہو جاؤ
حسن کہتا ہے جہاں جاؤ میرا عالم ہے

۷ــــــ تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

۸ــــــ تمہیں کالی گھٹا کا بھی نہیں پہچاننا آتا !!!
نشیمن سے دھواں اٹھتا ہے تم کہتے ہو ساون ہے

۹ــــــ آہ کیا یہ بھی ایک لطیفہ ہے
لب تک آتے ہوئے ہنسی ہو جائے

۱۰ــــــ اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو جل رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

۱۱ــــــ اوج جھک جاتا ہے دل سلطانِ طیبہ کے حضور
جب حرم کی سرزمیں پر سر کو خم کرتے ہیں ہم

۱۔ دھوکے میں آ نہ جائیں کہیں عقل و آگہی
آقائے کائنات لباسِ بشر میں ہے

۲۔ انھیں کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات انکی
انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی

۳۔ یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

۴۔ دیکھ اس قوم کی تذلیل نہ ہونے پائے
اپنے ایوانوں میں اس قوم کی آواز ہے تو

۵۔ غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

۶۔ تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

۷۔ دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

۸۔ محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازِ طوفاں نہیں ہوتا

۹۔ سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

۱۰۔ ہوتا ہے رازِ عشق و محبت یہیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

۱۱۔ یہ آستانِ یار ہے صحنِ حرم نہیں
جب رکھ دیا ہے سر تو اٹھانا نہ چاہیے

۱۔۔۔ بھروسہ اس کو کہتے ہیں گنہگاروں نے محشر میں
خدا کے سامنے ان کو پکارا ، یا رسول اللہ

۲۔۔۔ کہاں داغی، کہاں بے داغ دونوں کب برابر ہوں
نہ لالہ رنگ میں پایا ، چاند ان کی صفائی میں

۳۔۔۔ چاند سے تشبیہ دینا کیا یہی انصاف ہے
چاند پر تو چھائیاں ہیں ان کا چہرہ صاف ہے

۴۔۔۔ ہوش کی پہلے دوا کر بعد میں شوق سجود
یہ جبیں اور آستان رحمۃ للعالمین

۵۔۔۔ عشق احمد دیکھئے میرا لڑکپن دیکھئے ،
زلف کی زنجیر اور ننھی سی گردن دیکھئے

۶۔۔۔ وہ ہر عالم کی رحمت ہیں کسی عالم میں رہ جاتے
یہ ان کی مہربانی ہے کہ یہ عالم پسند آیا

۷۔۔۔ چارہ ساز بے کساں تجھ کو مسیحا جان کر
آ گئے در پر تیرے بیمار اٹھتے بیٹھتے

۸۔۔۔ اس کا پتہ نہ پوچھو بس آگے بڑھے چلو
ہوگا کسی گلی میں تو میلہ لگا ہوا

۹۔۔۔ زمانہ کچھ کہے دیوانے اپنی جان دے دیں گے
مگر دامن نہ چھوڑیں گے تمہارا یا رسول اللہ

۱۰۔۔۔ کیوں رضا آج گلی سونی ہے
اٹھ میرے دھوم مچانے والے

۱۱۔۔۔ یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ

۱۔ جب بھی آتا ہے میرا نام تیرے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

۲۔ پوچھتے ہو شہ جیلاں کے فضائل آ رہی
ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا

۳۔ کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق توفیق ہے گناہ نہیں

۴۔ ثابت ہوا جملہ فرائض فروع ہیں
اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

۵۔ مولا علی نے واری تیری نیند پر نماز
اور وہ بھی عصر سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے

۶۔ در بدر کب تک پھریں خستہ خراب
طیبہ میں مدفن عنایت کیجئے

۷۔ سب نے صف محشر میں للکار دیا ہم کو
اے بے کسوں کے آقا اب تیری دہائی ہے

۸۔ ارض مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے
جنت بھی یہیں مالک جنت بھی یہیں ہے

۹۔ بے حجابی یہ کہ ہر ذرے سے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

۱۰۔ یار تیرے حسن کو تشبیہ دوں کس چیز سے
ایک تو ہی دیدہ ہے باقی ہمہ نادیدہ ہے

۱۱۔ میری تصویر کے یہ نقش ذرا غور سے دیکھ
اس میں ایک عہد کی تاریخ نظر آئے گی

۱— ڈوبتے سورج سے پوچھا یہ ابھرتے چاند نے
کب سے ریگ گرم پر رکھا ہے رخسار حسین

۲— زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

۳— آہ کسی شہید ناز ہوں مردہ نہ جانیے
مر کر ملی ہے زندگی جاوداں مجھے

۴— کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

۵— جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

۶— ادھر آؤ پیارے ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

۷— ہو سکے تو لائیے دونوں جہاں میزان میں
میں نے ایک سجدہ زمین کربلا سے لے لیا

۸— زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

۹— ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

۱۰— اصل فتنہ ہے قیامت میں بہار فردوس
جز تیرے غیر نہ چاہے مجھے وہ دل دینا

۱۱— سنا ہے اس کو بھی غم ہے بہت جدائی کا
مگر وہ شخص تمہاری طرح اداس نہیں

۱۔۔۔ اخیر وقت ہے آ تسی چلو مدینے کو
نثار ہو کے مرو بیت سرور پر

۲۔۔۔ واللہ وہ سن لیں گے فریاد کو پہونچیں گے
اتنا بھی تو ہو کوئی جو آہ کرے دل سے

۳۔۔۔ کون دیتا ہے دینے کو منھ چاہیئے
دینے والا ہے سچا ہمارا نبی

۴۔۔۔ تیری نسل پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور تیرا سب گھرانہ نور کا

۵۔۔۔ سورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

۶۔۔۔ اصحاب مکرم کی تقلید کرو پہلے
پھر بعد میں زیبا ہے دعوائے مسلمانی

۷۔۔۔ چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو
مگر موج صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

۸۔۔۔ چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

۹۔۔۔ تیرے ہی در پہ مٹ جانا لکھا ہے میری قسمت میں
ازل میں یا ابد میں کہیں ہوتا نہیں ہوتا

۱۰۔۔۔ زمانہ آرہا ہے جب اسے سمجھیں گے سب اصغر
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں، خود تنہا سمجھتے ہیں

۱۱۔۔۔ لوگ مرتے بھی ہیں، جیتے بھی ہیں بیتاب بھی ہیں
کون سا شہر تیری چشم عنایت میں نہیں

۱ــــ پہونچا ہے عرش پر تنِ خاکیٔ مصطفےٰ
کس شان سے زمیں گئی آسمان پر

۲ــــ وہ سو جائیں تو معراجِ منامی
وہ جاگیں تو خدا سے ہم کلامی

۳ــــ نہ پوچھو رفعتِ انسانِ کامل
وہاں پہونچا جہاں چلتی نہ پر چلن

۴ــــ غش کھا گئے کلیم مگر ہنس پڑے حبیب
آنکھیں بدل گئیں تو نظارا بدل گیا

۵ــــ وسیلہ بھی بڑی شے ہے خدا تک
میں پہونچا تو مگر ، دامن بدامن

۶ــــ کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر
یہ کام ہے بیٹھے ہوئے بیکار نہیں ہیں

۷ــــ کمان امکاں کے جھوٹے نقطو تم اول آخر کے پھیر میں ہو
محیط کی چال سے تو پوچھو کدھر سے آئے کدھر گئے تھے

۸ــــ وہی ہے اول وہی ہے آخر، وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
اسی کے جلوے اسی سے ملنے اسی سے اس کی طرف گئے تھے

۹ــــ تبارک اللہ شان تیری تجھی کو زیبا ہے بے نیازی !!
کہیں تو وہ جوش لن ترانی کہیں تقاضے وصال کے تھے

۱۰ــــ ہے بے تاب جس کے لئے عرشِ اعظم
اسی دہ روئے لامکاں کی گلی ہے

۱۱ــــ اللہ رے تیرے جسمِ منور کی تابشیں
رعنائیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

۱۔ اللہ رے خود ساختہ قانون کا نیرنگ
جو بات کہیں فخر وہی بات کہیں ننگ

۲۔ اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

۳۔ اک دل ہمارا کیا ہے آزار اس کا کتنا
تم نے تو چلتے پھرتے مردے جلا دیئے ہیں

۴۔ بد ہیں تو آپ کے ہیں بھلے ہیں تو آپ کے
ٹکڑوں پہ آپ کے ہیں پلے رخ کدھر کریں

۵۔ کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار برق بار
اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

۶۔ کرے مصطفیٰ کی اہانتیں، کھلے بندوں اس پہ یہ جرأتیں
کہ میں کیا نہیں ہوں محمدی، ارے ہاں نہیں ارے ہاں نہیں

۷۔ ذکر روکے، فضل کاٹے، نقص کا جویاں رہے
پھر کہے مردک کہ ہوں امت رسول اللہ کی

۸۔ سورج الٹے پاؤں پلٹے چاند اشارے سے ہو چاک
اندھے نجدی دیکھ لے قدرت رسول اللہ کی

۹۔ دشمن احمد پہ شدت کیجیے
ملحدوں کی کیا مروت کیجیے

۱۰۔ مثل فارس زلزلے ہوں نجد میں
ذکرِ آیاتِ ولادت کیجیے

۱۱۔ وہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں!
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

۱ــــــ کوئی ان کی قبا کی بندشوں کو کچھ نہیں کہتا
میرا ذوقِ جنوں ہی مفت میں بدنام ہوتا ہے

۲ــــــ ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

۳ــــــ تنکا بھی ہمارے تو ہلائے نہیں ہلتا
تم چاہو تو ہو جائے ابھی کوہِ مَن پھول

۴ــــــ اہلِ عمل کو ان کے عمل کام آئیں گے
میرا ہے کون تیرے سوا آہ لے خبر

۵ــــــ رضا چل سے اب وجد کرتے گذر لے
کہ ہے ربِّ سلِّم صدائے محمد

۶ــــــ خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضائے محمد

۷ــــــ دل کے چمن کو لوٹنے والا ستم ظریف
یادوں کو اپنی چھوڑ کے ہر چیز لے گیا

۸ــــــ میرے چہرے پر دکھاوے کا تبسم ہے مگر
میری آنکھوں میں اداسی کے دیئے جلتے ہیں

۹ــــــ موجِ دریا سے یہ کہتا ہے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

۱۰ــــــ عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

۱۱ــــــ اے میری شامِ انتظار، یہ کون آ گیا لیے
زلفوں میں اک شبِ دراز آنکھوں میں کچھ کہانیاں

۱— انھیں چھوڑوں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ !!
میرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

۲— آہ وہ آنکھ کہ ناکام تمنا ہی رہی!
ہائے وہ دل جو تیرے در سے پُر ارماں گیا

۳— عقل ہوتی تو خدا سے نہ لڑائی لیتے
یہ گھٹائیں اسے منظور بڑھانا تیرا

۴— مٹ گئے مٹتے ہیں مٹ جائیں گے اعدا تیرے
نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

۵— بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

۶— چھٹ جائے اگر دولتِ کونین تو کیا غم
چھوٹے نہ مگر ہاتھ سے دامانِ محمد

۷— حشر کے دن میری چپ کا ماجرا
کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا

۸— چہرہ کھلی کتاب ہے عنوان کچھ بھی دو
جس رخ سے بھی پڑھو گے مجھے جان جاؤ گے

۹— آنکھیں رہیں گی شام و سحر منتظر تری
آنکھوں کو سونپ دیں گے ترا انتظار ہم

۱۰— اس نامرادِ عشق کو منزل ملے بھی کیوں
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو کھو کر حواس بھی

۱۱— باہر نہیں ہے اشک ابھی چشمِ تر میں ہے
آجاؤ گھر کی بات ابھی گھر کے گھر میں ہے

۱ ــــ بھروسہ مشعلوں پر تا بکجا اے کارواں والو
خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانو مقام اپنا

۲ ــــ تصور سے کسی کے جگمگاتی ہے سحر میری
کسی کی یاد سے روشن چراغ شام کرتا ہوں

۳ ــــ تو خود کو فرشتہ نہ سمجھ واعظ ناداں
دنیا میں تیرے رنگ کے انسان بہت ہیں

۴ ــــ یا تو دیوانہ ہنسے ، یا تو جسے توفیق دے
ورنہ اس دنیا میں آکر مسکراتا کون ہے

۵ ــــ یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلہ ہے بہت

۶ ــــ گردوں پہ اڑ رہا ہے پھریرا ہلال کا
جھنڈا گڑا ہوا ہے تیرا آسمان پر

۷ ــــ تم اپنے تغافل کا گلہ کیوں نہیں کرتے
کیوں دیتے ہو الزام میرے دیدۂ نم کو

۸ ــــ اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

۹ ــــ مجبور ہوں کہ وقت ہے افشائے راز کا
گو میں یہ جانتا ہوں کتنا نازک زمانہ ہے

۱۰ ــــ خون کے چھینٹے تیرے دامن پہ قاتل کس طرح
قتل ہونے میں کوئی بسمل اگر تڑپا نہیں

۱۱ ــــ ساحل کے سکون سے کسے انکار ہے لیکن
طوفان سے لڑنے میں مزہ اور ہی کچھ ہے

۱۔ آجائیے کہ آپ کو ترسے ہے اب نگاہ
دیکھا نہیں ہے ہم نے بہت دن گذر گئے

۲۔ اسی کشمکش میں گذری یہ حیات چند روزہ
کبھی دور رہ کے روئے کبھی پاس آکے روئے

۳۔ یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی ہم کو
جہاں سے لوٹنا ممکن نہیں ہمارے لیے

۴۔ کہاں ہے تو کہ تیرے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے

۵۔ اپنوں کی چاہتوں نے بھی کیا کیا دیئے فریب
روتے رہے لپٹ کے ہر اک اجنبی سے ہم

۶۔ تمہاری دید ہی مقصد رہا جس کی بصارت کا
وہ چشم منتظر پتھرا گئی کیا تم نہ آؤ گے

۷۔ آجائیے کہ آپ کو ترسے ہے اب نگاہ
دیکھا نہیں ہے ہم نے بہت دن گذر گئے

۸۔ ناحق ہے گلہ ہم سے، بے جا ہے شکایت بھی
ہم لوٹ کے آجاتے، آواز تو دی ہوتی

۹۔ بہت سنجیدگی بھی چوس لیتی ہے لہو دل کا
اسی خاطر تو ہم زندہ دلی کو پیار کرتے ہیں

۱۰۔ وہ موسم خزاں ہو کہ رُت ہو بہار کی
عادت سی پڑ گئی ہے تیرے انتظار کی

۱۱۔ اے حاصلِ خلوص بتا کیا جواب دوں
دنیا یہ پوچھتی ہے کہ میں کیوں اداس ہوں

- —— وہ ہر عالم کی رحمت ہیں کسی عالم رہ جاتے
یہ ان کی مہربانی ہے کہ یہ عالم پسند آیا

- —— جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے
تم نہیں چلتے رضاؔ سارا تو سامان گیا

- —— گناہوں سے پشیماں دیکھ کر اے داورِ محشر
تیری رحمت نے دھو ڈالا میرے دامانِ عصیاں کو

- —— منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

- —— بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

- —— رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا کے تھانے میں!!
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

- —— ادھر آؤ پیارے ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر، آزمائیں

- —— ہو سکے تو لائیے دونوں جہاں میزان میں
میں نے ایک سجدہ زمینِ کربلا سے لے لیا

- —— تیری نسلِ پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عینِ نور تیرا سب گھرانا نور کا

- —— غش کھا گئے کلیم مگر ہنس پڑے حبیب
آنکھیں بدل گئیں تو نظارہ بدل گیا

مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

فرش والے تیری شوکت کا علو کیا جانیں
خسروا! عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا

دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنالیں

دینے والے مجھے دینا ہے تو اتنا دیدے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہوجائے

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

ایک پیکر میں سمٹ کر رہ گئیں
حکمتیں، دانائیاں، آگاہیاں

ایک رند مست کی ٹھوکر میں ہیں
شاہیاں، سلطانیاں، دارائیاں

مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

فرش والے تیری شوکت کا علو کیا جانیں
خسروا! عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا

دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا لیں

دینے والے مجھے دینا ہے تو اتنا دیدے
کہ مجھے شکوہ کوتاہی داماں ہو جائے

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

ایک چٹکی میں سمٹ کر رہ گئیں
حکمتیں، دانائیاں، آگاہیاں

ایک رند مست کی ٹھوکر میں ہیں
شاہیاں، سلطانیاں، دارائیاں

نہ پوچھو رفعتِ انساں کا عالم — وہاں پہنچا جہاں چلمن پہ چلمن
وسیلہ بھی بڑی شے ہے خدایا — میں پہنچا تو مگر دامن بدامن

وہ جس کا بچھونا تھا کھجوروں کی چٹائی
سلطانِ عرب ہے وہ سلطانِ عجم ہے

آسان ہے ہر منزلِ دشوار نظامی
ہاتھوں میں جو سرکار کا دامانِ کرم ہو

بھڑک جاتی ہے جب یہ آگ تو بجھنے نہیں پاتی
چراغِ عشق جل جاتا ہے تو مدھم نہیں ہوتا

کسی کا راز رکھنے کو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ آنسو جھلملا جاتے ہیں دامن نم نہیں ہوتا

ہے یہی درسِ محبت، ہے یہی رسمِ وفا — آدمی کو آدمی کا غم اٹھانا چاہیئے

میرے سجدے تیرے سنگِ در کے گر قابل نہیں
بخش دے اپنے کرم سے ذوقِ رندانہ مجھے

غیرتِ ایماں کہاں سوئی ہے اٹھ کر دیکھ لے
لے چلی ان کی محبت سوئے بت خانہ مجھے

زندگی کاٹے نہ کٹتی آرزو کی چھاؤں میں
ہو گئی آسان خود بے مدعا ہونے کے بعد

اپنے کو مٹا دے جو رہِ عشق و وفا میں
یہ ذوق بہت خاص ہے کچھ عام نہیں ہے

کیا کسی منصور و سرمد نے کہیں آواز دی
آج ان کی ہر گلی میں کس کا قتلِ عام ہے

خرد کام آئے نہ آئے تو کیا غم، جنوں میرا اب میرے کام آگیا ہے

سلامت رہے آبرو اشکِ غم کی
محبت میں اکثر یہ کام آگیا ہے

کبھی بھولے بھٹکے جو یاد آگئے ہم
سلام آگیا ہے پیام آگیا ہے

نظامی یہ دار و رسن کی ہے منزل
الٰہی ثواب تمہارا مقام آگیا ہے

میری آرزو تھی انھیں ہم جو پاتے گلے مل کے روتے غمِ دل سناتے
نہ جانے ہوا کیا انھیں دیکھتے ہی قدم ڈگمگائے تو لب تھرتھرائے

فقیروں سے نہ الجھو ان کی دنیا ہی نرالی ہے
یہ گدڑی میں تو رہتے ہیں مگر گوہر لٹاتے ہیں

اب ہجرِ مسلسل سے میرا حال برا ہے
آجاؤ کہ ہر لمحہ قیامت کی گھڑی ہے

ہم خاک نشینوں کی ہر ایک بات ہے کمتر
وہ کچھ بھی کہیں ان کی ہر ایک بات بڑی ہے

ان کا دامن چھوڑ کے سجدہ کیا تھا آپ نے
اپنی پیشانی کا اب تو داغِ عصیاں دیکھئے

میری دنیائے تمنا ہر طرح آباد ہے
اک نہ تم کو پاسکے یہ آرزو باقی رہی

نصیبہ میرے دل کا دیکھنے والو ذرا دیکھو
لئے جاتا ہوں نذرانہ معین الدین چشتی کا

وہ گل میں مہک ہیں وہ شفق میں وہ چمک ہیں
ان لفظوں میں پوشیدہ ہے تفسیر کسی کی

نہ پتھر ہے نہ آہن ہے بڑی نازک امانت ہے
اشاروں سے بھی دل کا آبگینہ ٹوٹ جائیگا

نہ سایہ ہو جس کا مگر آدمی ہو
مدینہ میں ایسا بشر دیکھ جاؤ

آئے جو دمِ آخر سانس اپنی پلٹ آئی
کام آہی گئی آخر آج ان کی مسیحائی

تقصیر میری کیا ہے اے میرے کرم فرما
قدموں میں رہا لیکن دل میں نہ جگہ پائی

دل کا سکون آنکھ کی ٹھنڈک کہو جسے
وہ پرکشش حسین نظارہ چلا گیا

آزار یہ ایسا ہے سلگ جائے میری زیست
یہ دیس تو اپنا ہے، کوئی اپنا نہیں ہے

تمہیں کھو کے محسوس ایسا ہوا
کہ جیسے ہو کوئی خطا زندگی

یہ آنکھ کے آنسو ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے
جب سے وہ گیا ہے مجھے کچھ ہوش نہیں ہے

پھول سے نازک مزاجِ عشق اپنا ہے حضور
دشمنوں کے حق میں ہے تلوار اپنی زندگی

مرے گھر کے وہ دن بھی کتنے بھلے تھے
کبھی ان کا آنا کبھی ان کا جانا

اک آس ہے شاید کہ وہ گذریں گے ادھر سے
بس بیٹھا ہوا راہ گذر دیکھ رہا ہوں!!

دنیا نے میرا حال بڑے پیار سے پوچھا
تم بھی تو کبھی پوچھو کہ دن کیسے گزارے

نہ روندو خاکِ پروانہ نشانِ عشق رہنے دو
کہیں تم سے نہ لے بدلہ بڑا ظالم زمانہ ہے

مجھے دربدر پھرایا تیری جستجو نے آخر
تیرا آستاں جو پایا مجھے مل گیا ٹھکانہ

یہ جلے جلائے تنکے جو نشانِ غم بنے ہیں
میرا کون رہ گیا ہے جو مرے آشیاں پہ روئے

پل رہی ہے ایک دنیا تیرے در کی بھیک سے
کون ایسا سر پھرا ہے جو یہاں سائل نہیں

اس کی رحمت کو پیار آ جائے
ایسا کوئی گناہ کر لو !!

شاید کہ ترس آ جائے
مجھ پر بھی ایک نگاہ کر لو

پیکرِ وفا تم ہو
مجھ کو اس پر گواہ کر لو

تاکہ ڈھونڈیں شفیعِ محشر
اپنا دامن سیاہ کر لو

بے قراری، آہ زاری، سرد آہیں، اشکِ غم
اور کیا کیا چاہتے ہو اپنے دیوانے سے تم

زندگی کا راز افشا ہو گیا
ان کو دیکھا اور آنسو بہ گئے

اختتامِ تقریر

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک ہی بہت ہیں اگر کچھ اثر کرے

ہر قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے
جو کچھ ہوا بیان وہ آغازِ باب تھا

جمالِ یار کی رعنائیاں ادا نہ ہوئیں
ہزار کام لیا میں نے خوش بیانی سے

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اپنی تو اب تمام ہوئی کائناتِ غم
دو اشک تھے سو دیدۂ تر سے گزر گئے

ابھی اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
میری موت سے نہ ہوگی کبھی داستان پوری

ان کو صرف آنسو نہ سمجھو دوستو
داستانِ زندگی یہ کہہ گئے

اس کے بگڑے ہوئے کام سب بن گئے
جس نے دل سے پکارا منور علی

آسمانِ ولایت کا سب کچھ کہو
چاند سورج ستارہ منور علی

ان کے رخِ زیبا کو ابھی دیکھ رہا ہوں
اے موت ذرا رک جا ابھی سانس نہ ٹوٹے

محشر کی ہولناک مصیبت میں تمہارا
اے سیدِ لولاک کبھی ساتھ نہ چھوٹے

اس اشک کی قیمت کی کوئی حد ہی نہیں ہے
تقدیر سے جو دامنِ سرکار پہ ٹوٹے

شبیر یہ کہتے تھے میرے چاند ستارو
گو جان چلی جائے پر میدان نہ چھوٹے

رویا ہے نظامی نے کہیں خونِ جگر سے
دامن پہ نظر آتے ہیں جو بیل اور بوٹے

اے رحمتِ تمام ترے لطف و کرم سے
طیبہ میں میرے واسطے دو گز کی زمیں ہو

ناکام تمنا ہوں مگر آس بندھی ہے
سنگِ درِ جاناں پہ کبھی میری جبیں ہو

اللہ رے لب ہائے نبوت کا یہ اعجاز
جو بات وہ فرمائیں وہ قرآن جبیں ہو

گرم آنسو، سرد آہیں، داغِ دل، خونِ جگر
یہ متاعِ عشق لایا ہوں تمہارے دیس میں
سجدہ وہ رائیگاں ہے عبادت ہے سب فضول
جب تک شعورِ عشق نہ ہو بندگی کے ساتھ

کندہ ہے ان کا نام میرے نام ہی کے ساتھ
عظمت تو دیکھیے میرے لوحِ مزار کی !!
سو سو طرح سے دل کو تسلی دیا مگر
خنداں نہ ہو سکا دلِ ویراں ترے بغیر

اشک بن کر ڈھل رہا ہے خونِ دل خونِ جگر
یہ متاعِ عشق ہے پانی نہیں شبنم نہیں
ایک پروانے کے جلنے پر نہیں ہے منحصر
حسن کی کس انجمن میں عشق کا ماتم نہیں

میری آباد دنیا کو نہ روندو اپنے قدموں سے
تمہیں دل میں بٹھایا ہے نہ جانے کتنے ارماں سے
غمِ جاناں تو آ بھی جا کہ تیرا ہی سہارا ہے
میرا دل ڈوبا جاتا ہے خیالِ شامِ ہجراں سے

میرا دل ہی نہیں سارا زمانہ کانپ اٹھتا ہے
ستارے ٹوٹتے ہیں جب تمہاری نوکِ مژگاں سے

یہی ایک دن زمانے کی قیادت کرنے والے ہیں
جو دیوانے ابھی الجھے ہیں جیب و داماں سے
سرخروئی، سرفرازی، سربلندی واہ واہ
ان کے قدموں سے لپٹ جانے کا ثمرہ دیکھئے

مدتوں خاموش تھا میں آج ہی کے واسطے
دیکھنا ہے کون ٹکراتا ہے اس طوفان سے
اے نظامی چھوڑ دے افسانۂ شعر و سخن
یہ تیری منزل نہیں اور یہ تیرا عالم نہیں

اکیلا ہوں مگر آباد کر دیتا ہوں ویرانہ
بہت روئے گی میرے بعد میری شامِ تنہائی

اے گردشِ زمانہ کبھی رائیگاں نہ کرنا
ہیں بہت لطیف و نازک غمِ دل کی وارداتیں

یہ تو اپنا اپنا ہے حوصلہ یہ تو اپنی اڑان ہے!
کوئی اڑ کے رہ گیا بام تک کوئی کہکشاں سے گزر گیا

کہتے ہی کہتے عمر گزر جائیگی مری
ان کا بیان ہے یہ کوئی داستاں نہیں

اللہ رے تصورِ جاناں کی لذتیں
دیکھا کئے ہم ان کو جہاں تک نظر گئی

احساس کی شدت کا یہ کیسا تماشا ہے،
سیراب ہوں میں لیکن مجھ میں کوئی پیاسا ہے

آنکھیں کھلیں تو جاگ اٹھیں حسرتیں تمام
اس کو بھی کھو دیا جسے پایا تھا خواب میں

آرزوئے دل

جانِ و دِل ہوش و خرد سب تو مدینے پہونچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا
(سیدنا امام احمد رضا)

آخری وقت ہے آ۔ ہی چلو مدینے کو
نثار ہو کے مرو تربت پیمبر پر
(سرکار اہی)

مٹی نہ ہو برباد پس مرگ الٰہی،
جب خاک اڑے میری مدینہ ہوا ہو
(جناب میر)

محشر کی ہولناک مصیبت میں تمہارا
اے سید لولاک کبھی ساتھ نہ چھوٹے

دلائل

دو نہیں چار ہیں

آج کا عنوان بہت ہی خشک اور خالص علمی ہے، فروعی مسائل پر محض قرآن و حدیث کی دلیل طلب کرنے والوں کیلئے یہ کوئی ہلکی پھلکی تقریر نہیں بلکہ تازیانۂ عبرت ہے ـــــــ

ـــــــ اگر سامعین نے انشراح صدر اور بھرپور توجہ سے سماعت فرمایا، تو ایقان و اذعان کی بلند چوٹی سے ہر ایک اعلان کرے گا کہ یہ محض مقرر بنانے والی نہیں، مناظر بنانے والی تقریر ہے ـــــــ

ـــــــ اب اتری ہوئی صورت کے ساتھ نہیں ہشاش وبشاش چہرے کے ساتھ بیٹھئے۔ اور اس کا ایک ایک گوشہ محفوظ رکھئے تاکہ آپ اندھیرے سے اجالے میں آسکیں۔ اور اس حقیقت کو بھی بخوبی سمجھ سکیں کہ مغالطہ کیا ہے ـــــــ اور مغالطہ ـــــــ کیا ہے؟ ـــــــ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ حبیبہ الذی اصطفیٰ

اَمّا بَعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور حکم والوں کی جو تم میں سے ہوں۔

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے "مسائل کے ثبوت میں دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں۔

ہم اہلسنت وجماعت کے بہت سے معمولات ومراسم ہیں اپنے اپنے موقع ومحل پر جن مراسم کی ادائیگی ہوتی رہتی ہے۔ انھیں ہم فرائض وواجبات میں شمار نہیں کرتے۔ نہ مہماتِ دین کہتے ہیں، نہ اساس دین۔ ان میں سے اکثر کی حیثیت مباح، مندوب، مستحب اور مستحسن کی ہے یا اس سے کچھ زائد کی۔

مثلاً ہم میلاد شریف کرتے ہیں اور ۱۲، ربیع الاول کو جلوس عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ ہمارے معمولات میں ہیں لیکن ہم اسے فرض وواجب کی صورت نہیں دیتے۔ بلکہ یہ ہم نیاز مند غلاموں کی طرف سے اپنے آقا کی بارگاہ میں خراج عقیدت ہے۔ گویا یہ ہماری غلامی کی نشانی ہے۔ جلوس کا اہتمام آپ کے یہاں ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کا اہتمام کیجئے۔

بات آہی گئی ہے تو میں یہاں پر دو محفلیں "عید میلاد النبی" اور "جلوس
عید میلاد النبی" صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ایک واضح فرق بیان کرتا چلوں۔

محفل میلاد میں مقرر اور خطیب مسلمانوں کو مخاطب کرتا ہے چونکہ مجمع
خوش عقیدہ مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے لیکن جلوس میں ایسا نہیں ہے جلوس تو ایک
ایسی شاہراہ سے گذرتا ہے جس کے اردگرد فٹ پاتھ وغیرہ پر نہ جانے کتنے غیر
مسلم الگ الگ مذاہب کے کھڑے رہتے ہیں۔ مثلاً بمبئی ایک بین الاقوامی شہر ہے
جہاں قریب قریب بنام اسلام و مسلمان، سارے فرقے پائے جاتے ہیں ایسے
ہی پوری دنیا میں مختلف المذاہب قومیں آباد ہیں جس وقت جلوس عید میلاد النبی
صلی اللہ علیہ وسلم نکلتا ہے تو شہر کی اکثر قومیں مسلمانوں کا سر ہی سر دیکھ کر حیران
رہ جاتی ہیں کہ آیا یہ کون سا دن ہے کہ مسلمان اپنے گھروں میں تالا لگا کر باہر
نکل آیا ہے۔ لہٰذا نہ جاننے والے جاننے والے سے معلوم کرتے ہیں۔ آج کونسا
دن ہے کہ مسلمان دیوانہ وار گھروں سے باہر نکل آیا ہے؟ اب نہ جاننے
والوں کو جاننے والا بتاتا ہے کہ آج ہی کا وہ مبارک و مسعود دن ہے جبیں
مسلمانوں کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ آج مسلمان ان
کا جنم دن اور یوم ولادت منا رہا ہے۔ تو دنیا کی حساس قومیں ہمارے
بارے میں خیال کرتی ہیں کہ یہ عجیب و غریب قوم ہے کہ رہتی بھارت میں ہے
اور دامن مدینے والے کا تھامے ہے۔ پھر اس کے بعد ان کو اس کا یقین ہو جاتا
ہے کہ جب اس قوم نے اپنے "نبی" صلی اللہ علیہ وسلم کو فراموش نہ کیا تو ان کا
نبی، ان کو کیسے بھول سکتا ہے۔؟ یقیناً ان کی روحانیت اور فیض بخشی ان کے
کام آتی ہوگی۔ اور ہماری یہی ادا ہمارے زندہ قوم ہونے کی علامت و نشانی ہے

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہم اہل سنت کے بہت سے ایسے معمولات و
مراسم ہیں جن کی حیثیت فرائض و واجبات کی نہیں ہے لیکن ہمارا حریف اسکے
ثبوت میں قرآن و حدیث کی دلیل مانگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب قرآن و

حدیث سے ثابت کرو۔ اگر قرآن میں نہ دکھلا سکو تو کم از کم یہی کہیں دکھلا دو کہ رسول نے اپنی قوم سے کہا ہو کہ میری میلاد کرنا۔ اگر ہم کو یہ دکھلا دیا جائے تو ہم بھی میلاد شریف کرنے لگیں

ابتدائی مرحلہ میں ہمارا ان سے یہ کہنا ہے کہ میلاد شریف سرکار کے کہنے کی چیز نہیں بلکہ غلاموں کے کرنے کی ہے۔ یہ سوال تمہاری بوکھلاہٹ، قلبی پراگندگی اور ذہنی آوارگی کا نتیجہ ہے۔

تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ آقائے کائنات کی تاریخ صرف مسلمان ہی نہیں پڑھتا بلکہ دنیا کی اکثر قومیں پڑھتی ہیں۔ تمہارے مطالبے کی روشنی میں اگر کہیں رسول اللہ نے اپنی قوم سے فرمایا ہوتا کہ میرا میلاد کرنا، تو دنیا کی یہی قومیں ہمارا گریبان تھام لیتیں کہ مشتاق نظامی! کیا اسی رسول کا گن گا رہا تھا جو اتنا اقتدار پسند تھا کہ اپنے میلاد کی اپیل خود ہی اپنے قوم سے کیا کرتا تھا سید عالم روحی فداہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اس حقیقت پر بہت اچھی طرح مطلع تھے کہ "میلاد" میرے کہنے کی بات نہیں بلکہ غلاموں کے کرنے کی بات ہے یہ بات آپ کے مشاہدات میں ہے کہ بڑے بہت سی باتیں اپنے چھوٹوں سے کہتے نہیں مگر عقیدت کیش ان کارناموں کے انجام دہی میں بڑے کے حکم کا انتظار نہیں کرتے بلکہ بغیر کہے خود ہی پیش قدمی کرتے ہیں۔

مثلاً ہماری خوش نصیبی ہے ہم سب کے آقائے نعمت حضور سرکار مفتیٔ اعظم ہند رضی المولیٰ تعالےٰ عنہ اپنی حیات ظاہری میں رونق اسٹیج ہوتے اور مجلس ختم ہوتے ہی اٹھنے کا ارادہ فرماتے تو کوئی عصا پیش کرتا، کوئی جوتیاں سیدھی کرتا، کوئی رومال بڑھاتا، کوئی پان کا ڈبہ سنبھالتا۔ غرضیکہ خوشنودیٔ مزاج کی خاطر لپک کر بغیر حکم پائے ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگ جاتا۔ کوئی اس کا انتظار نہیں کرتا کہ حضرت فرمائیں تو عصا حاضر کیا جائے، حضرت حکم دیں تو پان کا ڈبہ لایا جائے۔ ایسا کیوں ہے؟ چوں کہ ان میں سے ہر نیازمند

یہ جاننا ہے کہ یہ حضرت سے کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ ہم غلاموں کے کرنے کی بات ہے۔ میرے خیال میں یہ کچھ ہمارے ہی یہاں کا دستور نہیں ہے ان کا بھی اپنے بڑوں کے ساتھ یہی شیوہ ہوگا لیکن وہاں شرک و بدعت کی پٹاری نہیں کھلتی۔ ترکش کے یہ سارے تیر وہیں پھینکے جاتے ہیں جہاں احترام نبوت اور عظمت رسالت کا سوال ہوتا ہے۔

بہر حال! اگر یہ اپنے ہوش میں ہوتے تو ایسا سوال ہرگز نہیں کرتے یہ تو تمہیدی خاکہ تھا یا عنوان سے متعلق ایک ذیلی گفتگو۔ اب آئیے اصل موضوع سے متعلق گفتگو ہو جائے۔

عنوان یہ ہے کہ "مسائل کے ثبوت میں دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں" اس سلسلے میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارے معمولات و مراسم سے متعلق ہمارا حریف قرآن و حدیث کی دلیل مانگتا ہے جس سے اس کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں دلیلیں صرف دو ہی ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ اور دلائل کو تسلیم کرتا تو صرف قرآن و حدیث ہی کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ دلائل کی فہرست میں اور بھی ذکر کرتا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ جب بھی دلیل مانگتا ہے تو صرف قرآن و حدیث ہی کا نام لیتا ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ آج آپ کو یہ حقیقت سمجھا دی جائے کہ دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں۔

ابھی آپ ذہن کی حاضری کے ساتھ تشریف رکھئے۔ آج کی گفتگو کٹھن اور سخت ہے۔ عوامی نہیں بلکہ درس گاہی تقریر ہے۔ اگر جی لگا کر آپ نے اس کو سمجھ لیا تو مقرر نہیں بلکہ اچھے خاصے مناظر آپ ہو جائیں گے۔

حضرات! دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں۔ اب ان کو ذہن نشیں فرمائیں۔

(۱) کتاب اللہ (قرآن) (۲) سنت رسول اللہ (حدیث) (۳) اجماع امت (۴) قیاس مجتہد۔

یہ عجیب طرفہ تماشہ اور حیرت انگیز بات ہے کہ میلاد و قیام پر محض قرآن

وحدیث کی دلیل طلب کرنے والے اپنی اپنی درسگاہوں میں اپنے طلبہ کو انھیں چار دلائل کو پڑھاتے ہیں۔

چنانچہ اصول فقہ کی ابتدائی کتاب "نورالانوار" کا متن ان اصول الشرع ثلثۃ کتاب اللہ و سنۃ رسول اللہ واجماع الامۃ والاصل الرابع القیاس۔

یہ کتاب ان کے یہاں بھی داخل نصاب ہے یعنی اصول شرع چار ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ اب مجھے دریافت کر لینے دیجئے کہ وہ کونسا داعیہ ہے کہ درسگاہ میں طلبہ کو چار دلیلیں پڑھائی جائیں اور میلاد شریف کرنے والوں سے محض دو دلیلیں مانگی جائیں۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اس مختصر سی گفتگو نے بہرحال آپ کو اس نتیجہ تک پہونچا دیا ہوگا کہ گلے کی رگیں پھلا پھلا کر میلاد و فاتحہ کی دلیل مانگنے والے یا تو فریب خوردہ ہیں یا فریب دہندہ۔ بہرحال دونوں کے یا کسی ایک کے مریض ہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ ایسے فریق کو کس طرح منھ لگایا جائے۔ لیکن اپنے احباب و عوام کو سمجھانے اور مطمئن کرنے کی خاطر یہ ساری زحمتیں اٹھانی پڑیں۔

حضرات! چند باتیں پہلے ذہن میں نوٹ کرلیں تب گفتگو آگے بڑھائی جائے۔ (۱) دلائل دو نہیں بلکہ دلائل چار ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع امت قیاس مجتہد۔

(۲) جیسا دعویٰ ہو ویسی دلیل مانگی جائے۔ یعنی اگر قرآن کا دعویٰ ہو تو قرآن سے دلیل مانگی جائے۔ اگر قیاس کا دعویٰ ہو تو قیاس سے دلیل مانگی جائے۔

(۳) دلیل کا فراہم کرنا منکر کی ذمہ داری ہے یعنی منکرین قیام کو دلیل دینی پڑے گی کہ قیام کیوں نہ کیا جائے؟ قیام کرنے والے سے دلیل نہیں مانگی

صرف یہی کہا ہے کہ وامسحوا برؤسکم تم لوگ اپنے سروں کا مسح کرو مگر قرآن نے کوئی مقدار نہیں متعین کی۔ پورا۔ آدھا۔ تہائی۔ چوتھائی۔ بلکہ آیت مطلق ہے بس اتنا ہی حکم ہے کہ اپنے سروں کا مسح کرو۔

اب آئیے بارگاہِ رسالت میں جس کا قول وفعل قرآن کے اجمال کی تفصیل ہے۔ صحابیٔ رسول حضرت مغیرہ بن شعبہ اس کے راوی ہیں فرماتے ہیں اتی سباطۃ قوم فبال وتوضأ ومسح علی ناصیتہ۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ وسلم قوم کے کوڑے خانے پر تشریف لائے اور استنجا فرمایا۔ پھر وضو فرمایا اور چوتھائی سر کا مسح کیا۔

معلوم ہوا مسح کی فرضیت قرآن سے لی جائے گی مگر اس کی مقدار کا تعین فعل رسول سے ہے۔ اگر اللہ کے رسول کا وضو نہ دیکھا جائے تو وہ تمہاری خواہش نفس کا وضو ہوگا۔ من مانی بلا دلیل ہوگا یعنی وہ شرعی وضو تو ہوگا مگر شرعی وضو نہ ہوگا۔

بس دعویداران اہل قرآن سے کہہ دیجئے کہ حدیث رسول دیکھے بغیر جب وضو میں سر کا مسح تک نہیں کرسکتے۔ تو بھلا بیع وشراء، نکاح وطلاق روزہ ونماز، حج وزکوٰۃ جیسے بے شمار پھیلے ہوئے مسائل ہیں۔ حدیث کو چھوڑ کر ایسے مسائل کا حل کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے؟

حضرات! معلوم ہوا۔ قرآن اصل الاصول تو ضرور ہے مگر اس کی تشریح وتفصیل کے لئے حدیث کو دلیل بنانا بہت ضروری ہے۔ ورنہ زندگی کے بے شمار مسائل میں بریک لگ جائے گی۔ اور تعطل پیدا ہو جائے گا۔ اور یہ زندگی وبالِ جان اور دوبھر ہو جائے گی۔ بظاہر دعویٰ بہت اونچا ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اس کا کھوکھلاپن بھی آشکارا ہے۔

اور آگے بڑھئے اہل قرآن کے بعد دوسرے فرقے نے سر اٹھایا

جائے گی۔

(۴) صرف دلیل کہہ دینا کافی نہ ہوگا بلکہ وہ دلیل جو مثبت مدعا ہو یعنی ایسی دلیل جس سے دعویٰ اور مدعا ثابت ہو۔

آنے والی گفتگو سے پہلے ان اصولوں کا ذہن نشین رکھنا بہت ضروری ہے۔

حضرات! میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسائل کے ثبوت میں دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں۔ اب اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

مثلاً ایک فرقہ ہے "اہل قرآن کا" اس کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی دلیل نہیں چاہئے۔ بظاہر یہ دعویٰ بہت بھاری بھرکم جاذب نظر، پرکشش اور باوزن معلوم ہوتا ہے لیکن ایسی غیر معقولیت اور کھوکھلا پن شاید ہی آپ کو کہیں اور مل سکے۔

ان سے کہئے زندگی کے ہزار ہا ہزار مسائل تو آپ ایک طرف کر دیجئے۔ اگر آپ صحیح معنوں میں "اہل قرآن" ہیں۔ تو قرآن ہی کی روشنی میں صرف "وضو" کر کے دکھا دیجئے جسے وضو کہا جا سکے۔

وہ سب سے پہلے ہاتھ دھوئیں گے۔ ان سے دریافت کیجئے کہ جناب! قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ سب سے پہلے منہ دھوؤ۔ یہ ہاتھ کیوں دھویا جا رہا ہے۔

(۲) پھر وہ کلی کریں گے۔ دریافت کیجئے۔ قرآن میں کہاں ہے کلی کرنا۔ (۳) وہ ناک میں پانی ڈالیں گے، دریافت کیجئے قرآن میں کہاں ہے ناک میں پانی ڈالنا۔ (۴) وہ مسح کریں گے ان سے دریافت کیجئے مسح کی مقدار کیا ہوگی۔ پورا سر کہاں ہے۔ قرآن میں آدھا سر کہاں ہے قرآن میں؟ تہائی سر کہاں ہے قرآن میں، چوتھائی سر کہاں ہے قرآن میں؟ مجبوراً تم کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو دیکھنا ہوگا۔ قرآن نے تو

ہم اہل حدیث ہیں! جس کا کہنا یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے کوئی دلیل نہیں چاہیے۔

حضرات! یہ گذشتہ صدی کی پیداوار ہیں پہلے تو یہ "محمدی" تھے۔ پھر اہل حدیث" ہوئے۔ اب "سلفی"۔ آئندہ دیکھئے کیا چولا بدلتے ہیں۔ چونکہ یہ غیر مقلد ہیں۔ سوچتے ہوں گے کہ اگر ایک ہی نام رہا تو تقلید کی بہت گہری چھاپ لگ جائے گی۔ لہذا اپنی "غیر مقلدیت" کی حفاظت کی خاطر کچھ دنوں کے بعد اپنا نام بدل دیتے ہیں۔

یہ بار بار نام تجویز کرنا، پھر بدل دینا، پھر تجویز کرنا، پھر بدل دینا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ پرانے نہیں بلکہ نئی پیداوار ہیں۔ جوانوں اور بوڑھوں کا نام نہیں بدلا جاتا۔ چھوٹے بچوں کے نام میں ابتداءً تبدیلی ہو جاتی ہے۔ دادا نے کچھ نام رکھا۔ نانا نے دوسرا نام اور بعض دوسرے گھر والوں نے تیسرا۔

اب ان نام نہاد اہل حدیث یعنی غیر مقلدین سے دریافت کیجئے کہ اگر حدیث کے بعد آپ کو کوئی دلیل نہ چاہیے تو یہ بتلائیے کہ قرآن نے سود سے متعلق کہا ہے وحرم الربوا لین دین میں زیادتی سود ہے۔ سرکار نے چند چیزوں میں اس کی تفصیل بتادی۔

الحنطة بالحنطة الشعیر بالشعیر الذهب بالذهب الفضة بالفضة الملح بالملح التمر بالتمر۔

سرکار نے ان اشیاء کو شمار فرمایا۔ اب اگر کوئی کہے کہ حضور نے گیہوں اور جو کا ذکر فرمایا۔ چنا، مٹر، چاول، سرسوں وغیرہ کا ذکر نہیں فرمایا لہذا ان اشیاء میں سود لینا دینا دونوں درست ہوگا۔

اب فرمائیے! اگر آپ صحیح معنوں میں سلفی اور اہل حدیث ہیں تو اسے حدیث ہی سے ثابت کیجئے۔

اجی جناب! آپ حدیث کی تعریف تو حدیث سے کر ہی نہیں سکتے پھر ان قیاسی مسائل کی صراحت اس میں کہاں پائیں گے۔ بس سمجھ میں آیا کہ یہیں سے کام مجتہد کا شروع ہوتا ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ جواز اجتہاد سے متعلق ایک حدیث کا مفہوم نقل کر دیا جائے۔

آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر مقرر فرمایا۔ جب یمن کے لئے روانہ فرمانے لگے تو معاذ سے ایک سوال کیا معاذ تم ایک بڑے عہدہ پر جا رہے ہو۔ لوگ تمہارے پاس اپنے اپنے مقدمات لائیں گے۔ لہٰذا تم اس کا فیصلہ کیسے کرو گے؟

معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اس کا فیصلہ قرآن سے کریں گے سرکار نے فرمایا اے معاذ! اگر تم نے اس کا جواب قرآن میں نہ پایا تو کیا کرو گے معاذ نے عرض کیا سرکار پھر ہم آپ کی حدیث دیکھیں گے اور اس سے فیصلہ کریں گے۔

آقائے کائنات نے ارشاد فرمایا اگر تم نے اس میں بھی نہ پایا تو کیا کرو گے عرض کیا اجتہد برائی، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس سے استنباط و استخراج کی کوشش کروں گا۔ اجتہد کی صراحت نے واضح کر دیا کہ میں اجتہاد کروں گا۔

سرکار نے اس جواب پر معاذ کو زجر و توبیخ نہیں فرمائی بلکہ انتہائی مسرت سے ان کی پشت پر تحسین و مرحبا فرماتے ہوئے اپنا دست کرم رکھ دیا اور فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے رسول کو توفیق عطا فرمائی۔ اگر اجتہاد جرم و خطا ہوتا۔ ناپسندیدہ، ناقابل قبول ہوتا تو سرکار اس پر نکیر فرماتے، اسے رد فرما دیتے اور فرماتے کہ حیرت ہے کہ قرآن و حدیث کے ہوتے تم اپنی رائے سے فیصلہ کرو گے۔؟ لیکن سرکار نے بجائے ناخوش ہونے کے اپنی رضامندی کی سند عطا فرما دی۔ اس لفظ "اجتہد"

سے "اجتہاد" کا دروازہ کھل گیا ہے۔ کیا تعجب کہ اس کا ماخذ بھی یہی ہو۔

جب بات آ ہی گئی ہے تو اس حدیث مبارکہ سے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہوا چلوں۔ سرکار نے معاذ سے فرمایا تم فیصلہ کیسے کرو گے؟ حضرت معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ قرآن مجید سے۔ تو سرکار نے فرمایا کہ اے معاذ اگر قرآن میں نہ پاؤ گے تو کیا کرو گے۔

یہیں سے معلوم ہوا کہ قرآن میں ہونا اور ہے۔ ہمارا نہ پانا اور ہے۔ اس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ اس کا جواب قرآن میں تو ہوگا۔ اگر تم نہ پاؤ گے تو کیا کرو گے۔ ایسے ہی حدیث کے بارے میں فرمایا کہ اگر اس میں بھی نہ پاؤ گے تو کیا کرو گے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اگر حدیث میں نہ ہوگا تو کیا کرو گے یہ فرمایا کہ نہ پاؤ گے تو کیا کرو گے۔

بات واضح ہو گئی۔ حدیث میں ہونا اور ہے اور ہمارا نہ پانا اور ہے اس کی تفصیل قرآن والی تقریر میں ملاحظہ فرمائیں۔

بہر حال! حضرت معاذ کے جواب نے متعین کر دیا کہ اجتہاد، اور قیاس درست ہے ورنہ سرکار اس کی اجازت نہ مرحمت فرماتے۔

اب آئیے ہم لوگ مل جل کر فیصلہ کریں کہ مجتہد کا کام کیا ہے۔

حضرات! یہ ریڑھ کی بات ہے: اگر جی لگا کر آپ نے سمجھ لیا تو بہت سے الجھے مسائل کو اسی کی روشنی میں حل کر سکیں گے۔ دیکھئے! ابھی میں نے عرض کیا تھا سود سے متعلق قرآن بس یہ کہتا ہے کہ حرم الربوا یعنی لین دین میں زیادتی سود ہے۔ میرے سرکار نے اس کی تفصیل میں گیہوں، جو، سونا، چاندی، نمک اور کھجور کا تذکرہ فرمایا۔

اب سائل کا سوال یہ تھا کہ پھر مسور کی دال، چنا، مٹر، دھان، چاول وغیرہ کا مسئلہ کیا ہوگا۔؟

حضرات! یہی آپ کو سمجھنا ہے کہ اب یہیں سے مجتہد کا کام شروع ہوتا

ہے۔ یعنی وہ اپنے مسائل میں جد وجہد سے علت مشترکہ تلاش کرتا ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے "شراب حرام ہے۔" تو اب ایک مجتہد غور وفکر کرے گا کہ آخر شراب حرام ہونے کی علت کیا ہے۔ پہلے وہ منفی کو توڑے گا پھر مثبت کو اپنی گرفت میں لے گا۔ اس کو یوں سمجھئے۔ مثلاً وہ شراب کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے کہ شراب کیا اس لئے حرام ہے کہ وہ بوتل میں بند ہے تو اب اس علت کو وہ توڑے گا۔ وہ یہ کہے گا کہ اگر شراب کی حرمت اس لئے ہے کہ بوتل میں بند ہے ایسی صورت میں جتنی چیزیں بوتل میں بند ہیں سب کو حرام ہونا چاہئے۔

معلوم ہوا کہ شراب ہونے کی علت یہ نہیں ہے۔ پھر وہ غور کرتا ہے۔ کیا شراب اس لئے حرام ہے کہ وہ رنگین ہے؟ اگر رنگین ہونا حرمت کی وجہ ہو جائے تو بوتل کی ہر رنگین شے کو حرام ہونا چاہئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا حرمت کی وجہ رنگین ہونا نہیں ہے۔ پھر وہ غور کرتا ہے کیا اس لئے شراب حرام ہے کہ وہ سیال ہے بہنے والی ہے؟ اگر سیال اس کی علت ہو جائے، تو بوتل کی ہر بہنے والی شے کو حرام ہو جانا چاہیۓ مگر ایسا نہیں ہے اسی کا نام ہے پہلے منفی کو کاٹنا اور توڑنا یعنی جس قدر منفی پہلو کے گوشے نکلیں گے۔ سب سے پہلے اس کو مسترد کر دے گا۔ اب تفصیلاً غور کرتا ہے کہ بوتل میں بند ہونا حرمت کی علت نہیں۔ رنگین ہونا علت نہیں ہے۔ سیال ہونا علت نہیں؟ تو جب سب کو توڑ دیا تو آخر میں اس کا مثبت پہلو اپنی گرفت میں لے کر کہتا ہے یہ سب کچھ نہیں بلکہ شراب کی حرمت کی علت "سُکر" یعنی نشہ ہے۔

لہٰذا اب وہ اس پر قیاس کرتا ہے کہ جہاں جہاں نشہ پایا جائے گا۔ وہاں وہاں حرام کا حکم دیا جائے گا۔ چونکہ ضابطہ یہ ہے کہ جہاں جہاں علت پائی جائے گی وہاں وہاں معلول بھی پایا جائے گا۔ اسی کا نام ہے علت مشترکہ۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں علت مشترکہ کی تجسس وتلاش اور اس کا استخراج واستنباط یہی مجتہد کا بنیادی کام ہے۔ لہٰذا جب وہ کسی منصوص صراحت

میں اسکی علت نکال لیتا ہے تو پھر اس کے حکم کو عام کر دیتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ علت جہاں جہاں پائی جائے گی وہاں وہاں یہ حکم بھی پایا جائے گا۔ اگر اجتہاد کا دروازہ کھلا نہ ہوتا تو اسلامی زندگی مفلوج و معطل اور اجیرن ہو جاتی۔ یہ ائمہ مجتہدین ہی کی دین ہے کہ زندگی کے بے شمار مسائل ہزارہا ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اور واضح رہے کہ یہ کام ہر نتھو بدھو خیرو کا نہیں ہے بلکہ یہ کام ائمہ مجتہدین کا ہے جس کی نگاہ ترجمۃ القرآن سے لے کر احادیث اسماء الرجال، عربی گرامر، معانی و بیان، زبان کے مصطلحات، لغات و محاورات وغیرہ سب پر ہو۔ اور اجتہاد کے لئے جن اصول و ضوابط اور علوم و فنون کی ضرورت ہو اس سے اور اس کے طبقات کے ماسوا پر بھی نظر غائر اور دستگاہ کامل رکھتا ہو۔ دل خشیت الٰہی سے لبریز، عبادت اس کی فطرت اور تقویٰ اس کا شعار بن چکا ہو۔

اب موقع آ ہی گیا ہے تو حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سماعت فرمائیں۔

امام احمد بن حنبل، امام شافعی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے تلامذہ اور شاگردوں میں ہیں۔ ایک بار حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنے استاد حضرت سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو خط بھیجا کہ میں خود آکر حاضر خدمت ہونا چاہتا ہوں۔ منظوری دی گئی اور آپ نے رخت سفر باندھا۔ ادھر خلیفۂ وقت کو معلوم ہوا کہ احمد بن حنبل آنے والے ہیں تو خلیفہ نے امام شافعی سے درخواست کی کہ میں ان کی میزبانی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ امام شافعی نے اسے مسترد کر دیا۔ فرمایا "استقبال لے سکتے ہو۔ لیکن وہ مہمان میرے ہوں گے۔ خلیفہ نے اسی کو غنیمت جانا۔ شاہانہ استقبال کی تیاری کی گئی۔

امام شافعی کے گھر میں خوشیوں کے چراغ جل اٹھے۔ بچے پھولے نہ سماتے

کو میرے والد گرامی کے ارشد تلامذہ میں سے ایک بہت ہی بلند و بالا اور قد آور شخصیت آنے والی ہے۔ انگلیوں کے پوروں پر یہ دن گنے جا رہے ہیں۔ آخر وہ ساعت سعید آئی۔ مصر میں حضرت امام احمد بن حنبل کا شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ بہت ہی پر تکلف و نیاز مندانہ استقبالیہ دیا گیا۔ سب کی زبان پر اہلاً و سہلاً، مرحبا اور خوش آمدید تھا۔ اب اس کے بعد حضرت سیدنا امام احمد بن حنبل، کاشانۂ شافعی میں تشریف لائے۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ اور گھر جشن چراغاں سے معمور و منور تھا۔

آج ایک معزز مہمان کے اعزاز میں دار الخلافہ میں علما، فضلا، مشائخ اور عمائد سبھی کو دعوت طعام دی گئی ہے۔ اب وہ وقت بھی آ گیا کہ دسترخوان چن دیا گیا۔ اپنے وقت کے شیوخ، اہل علم، اہل زبان، اہل قلم، اہل ثروت دسترخوان پر رونق افروز ہیں۔ امام شافعی کے بچوں کا دل بلیوں اچھل رہا ہے۔ آج ان کا قدم زمین پر نہیں آسمان پر ہے۔ مہمان نوازی میں مصروف ہیں۔ کوئی پانی لیے کھڑا ہے تو کوئی سالن لا رہا ہے۔ صاحب خانہ نے اجازت دی کہ بسم اللہ کیا جائے مصری مہمانوں کے پر تکلف ہاتھ دسترخوان کی جانب بڑھے۔ بھری محفل میں جتنا تکلف کیا جا سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ آج ایک معزز میزبان کے دسترخوان پر تکلف برتا جا رہا ہے۔ لیکن امام احمد بن حنبل جن کے اعزاز میں دعوت دی گئی ہے وہ روٹیوں کے بڑے بڑے توالے لے رہے ہیں اور بڑی عجلت سے کھا رہے ہیں۔

امام شافعی کے بچوں نے جیسے ہی اس منظر کو دیکھا، شرم سے گردن جھک گئی۔ اور پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اب ان کے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ بچے تو بہر حال بچے ہوتے ہیں انھوں نے سوچا کہ شاگرد ہونے کے ناطے شاید والد صاحب نے مبالغہ سے کام لیا ہو۔ اور ان کی عظمت و شہرت کا غلط پروپیگنڈہ کر دیا ہے۔ جو شخص آداب دسترخوان سے بھی ناواقف

ہو اسے امام وقت کیسے کہا جا سکتا ہے؟ آن کی آن میں ہزاروں باتیں ذہن میں گذر گئیں چنانچہ اب دسترخوان سمیٹ دیا گیا اور مہمان رخصت ہونے لگے لیکن امام احمد ابن حنبل کی وہ بات بچوں کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ نہ رہا گیا تو بچوں نے والد سے شکایت کی اور ان کو یاد دلایا کہ اسے والد گرامی کیا آپ نے احمد ابن حنبل کو دسترخوان پر کھاتے دیکھا؟ امام شافعی نے جواب دیا ہاں دیکھا۔ بچوں نے اپنی زبان میں دریافت کیا کیا دیکھا۔ امام شافعی خاموش ہو گئے۔

بچوں نے خود ہی کہا۔ ابا جان! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شاگرد ہونے کے ناطے بڑھا چڑھا کر غلط پروپیگنڈہ کر دیا گیا ہو؟ امام شافعی نے جواب دیا ایسا نہیں ہے۔ یہ خود اپنے زمانے کا بڑا امام ہے۔ بچوں نے کہا ایسے دل کیسے ملنے جو آداب دسترخوان بھی نہ جانتا ہو اسے امام وقت کہا جائے۔ آخر ہمارے دوسرے مہمانوں نے کیا سوچا ہوگا؟

امام شافعی خاموش رہے۔ میزبان اور مہمان کا رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے بھلا ایک معزز مہمان سے یہ کیسے دریافت کر سکتا ہے کہ آپ نے اتنے بڑے بڑے نوالے کیوں لئے۔ اور جلدی جلدی کھانا کیوں تناول کئے؟ مگر بچوں کا ذہن تشویش میں رہا اور ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ انھیں کسی دوسرے طریقے سے آزمایا جائے کہ آیا یہ واقعی امام ہیں یا نہیں؟

چنانچہ جیسے بچے ویسا امتحان! ان لوگوں نے مشترکہ طور پر طے کیا کہ جب امام احمد ابن حنبل اپنی چارپائی پر لیٹ جائیں تو سرہانے لوٹے میں پانی بھر کر رکھ دیا جائے اور صبح سویرے اٹھتے ہی سب سے پہلے لوٹا دیکھا جائے کہ وہ پانی سے خالی رہتا ہے یا بھرا۔ اگر خالی ہو جائے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ حضرت نے نماز تہجد کے لئے وضو فرمایا اور اگر بھرا رہ گیا تو ہم سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ رات بھر سوتے رہے۔ اور خراٹے لیتے رہے۔ نماز تہجد تک نہیں پڑھی۔ بچوں نے امام کے سرہانے لوٹے میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ بڑی مشکل

سے نیند آئی۔ صبح اٹھتے ہی بچوں نے لوٹا دیکھنا شروع کیا تو حیرت اور زیادہ بڑھ گئی شبہات یقین سے بدل گئے۔ کیا دیکھا کہ لوٹا پانی سے بھرے کا بھرا ہے۔ اس کی کوئی بوند خرچ نہیں کی گئی۔

اب بچے امام شافعی کو گھیرے ہیں کہ ابا جان! آپ صاف صاف بتائیں کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ یہ سچ ہے ایک عظیم شخصیت ہیں یا ہم سریوں کو دھوکہ میں کھا گیا ہے؟ نہیں بیٹا ایسا نہیں۔ یہ امام وقت ہیں۔ بچوں نے کہا کہ ان باتوں کو حل کرائیے۔ بہر حال جہاں میزبان و مہمان میں تکلفات بہت ہوتے ہیں وہیں استاد و شاگرد میں باپ بیٹا جیسا تعلق ہوتا ہے۔

چنانچہ استاد و شاگرد کے ملتے امام نے دریافت کیا اے احمد یہ تم کو کیا ہو گیا کہ رات دسترخوان پر بیٹھے تو "روٹی کے بڑے بڑے نوالے جلدی جلدی کھاتے رہے" اور جب رات بچوں نے تمہارے سرہانے لوٹے میں پانی بھر کے رکھ دیا تو تم ساری رات سوتے رہے۔ نماز تہجد تک نہیں پڑھی۔ کب سے تمہارا یہ رویہ ہو گیا ہے۔؟

امام حنبل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آواز بھرا گئی۔ نظروں سے قدمبوس ہوئے۔ عرض کیا حضور! یہ سچ ہے کہ میں نے روٹی کے بڑے بڑے نوالے لئے اور جلدی جلدی کھایا۔ مگر بات یہ دیکھی میں نے کہ یہ کسی دنیا دار کا دسترخوان نہیں ہے یہ وہ دسترخوان ہے جو اکل حلال کھاتا ہے اور دوسروں کو اسکی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ دسترخوان سے آسمان تک نور کا دھارا ہی دھارا ہے۔ دل میں خیال آیا کہ یہ نعمت روز روز میسر نہیں آئے گی۔ مل گئی ہے تو فائدہ اٹھا لیا جائے۔ لہٰذا میں جلدی جلدی کھانا نہیں کھا رہا تھا بلکہ اسی بہانے نور الٰہی سے اپنے دل کو معمور کر رہا تھا۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ آج ساری رات سویا نہیں۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے قرآن و سنت کی روشنی میں تقریباً تین سو سے زائد مسائل کا استخراج و استنباط کیا۔ فالحمد للہ تعالیٰ ذالک

حضرات! آپ کو دوسرا ضابطہ یہ سمجھانا ہے کہ جیسا دعویٰ ہو، ویسی دلیل مانگی جائے۔

مثلاً اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ مثلث کے تینوں زاویے برابر دو زاویہ قائمہ کے ہیں۔ اور وہ یہ کہے کہ اگر قرآن میں نہ دکھلا سکو تو کم از کم کسی حدیث ہی میں دکھلا دو۔ اس کو دلیل مانگنا نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کہا جائے گا۔ یعنی یہ اصول اقلیدس کا ہے، جامیٹری کا ہے۔ لہٰذا اگر جامیٹری اور اقلیدس کا اصول ہے تو اسکی دلیل میں قرآن و حدیث کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ بلکہ اقلیدس کا مطالبہ کیا جائے۔

ایسے ہی اگر یہ کہا جائے کہ عناصر میں کون و فساد ہوتا ہے تو کوئی کہے کہ قرآن مجید بخاری شریف میں دکھا دو۔ بخاری نہ سہی، صحاح ستہ کی کسی کتاب میں دکھاؤ۔ تو علمی دنیا اسے پاگل خانہ بھجوائے گی۔ کیونکہ یہ فلسفہ کا قانون ہے۔ لہٰذا دلیل میں فلسفہ کی کتاب کا نام لو۔ قرآن و حدیث کا نہیں۔

عربی گرامر کا قاعدہ یہ ہے کہ نکرہ جب تحت نفی واقع ہوتا ہے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ آپ مشکوٰۃ شریف سے دلیل نہ مانگو۔ بلکہ عربی گرامر سے دلیل مانگو۔ کہنا یہ ہے کہ اگر دعویٰ قرآن کا ہو تو دلیل میں قرآن کا نام لو اور حدیث کا دعویٰ ہو تو حدیث سے دلیل مانگو۔

اب اسے چند مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

(۱) حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ جو اپنے وقت کے بلند پایہ محدث گذرے ہیں جن کے بارے میں خود آقائے کائنات نے پیشن گوئی فرمائی کہ میرے بعد ایک ایسا شخص ہوگا جس کے پاس لوگ دور دراز سے اونٹوں پر بیٹھ کر حدیث لینے آئیں گے۔ اسے اعلم مدینہ کہا جائے گا۔ سرکار نے نام تو نہیں

یہ سنتے ہی امام شافعی کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک گئے۔ اور بے شمار دعائیں دیں۔

یہ سنکر بچوں کے دل کا کانٹا دور ہو گیا اور عقیدت کی فراوانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ یہ ہیں وہ ائمہ مجتہدین جن کی تقلید کا قلادہ آج کروڑوں، مسلمانوں کے گلے میں ہے۔ ان میں ہر فرد اپنے آپ کو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے

حضرات! گفتگو کو طول دینا مقصود نہیں ہے چونکہ غیر مقلدین ائمہ مجتہدین کی طرف سے عوام کو اکثر و بیشتر گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے میں نے مناسب جانا کہ اس مقدس گروہ کی حرمت و عظمت اجاگر کر دی جائے۔

ہر حال میں سمجھانا یہی چاہتا تھا کہ بغیر قیاسی مسائل کے اگر قرآن و حدیث کے بعد دروازۂ اجتہاد نہ کھلا ہوا ہوتا تو آج قدم قدم پر زندگی کی راہوں میں گھٹا ٹوپ تاریکی ہوتی۔ لہٰذا مجتہدین نے ایسی روشنی دیدی جو تاریکیوں میں اجالے کا کام دے جس سے کروڑہا مسلمان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ البتہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد غیر مقلدین نے اٹھا رکھی ہے جو مٹھی بھر تعداد کی بھی حیثیت نہیں رکھتے

لیا مگر راویان حدیث کا یہی کہنا ہے کہ اس سے مراد حضرت امام مالک ہیں۔ وہ ایک روز اپنے تلامذہ کے ساتھ مدینہ کی گلی سے گذر رہے تھے۔ اچانک ایک پرانی، بوسیدہ دیوار پر نظر پڑی جو گری جا رہی تھی۔ امام مالک نے تلامذہ کو وہیں چھوڑ دیا۔ آگے بڑھ کر اس دیوار کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ واپس آگئے شاگردوں نے پوچھا حضور! یہ دیوار کیوں چومی جا رہی تھی۔ فرمایا دیوار کہاں چوما۔ لوگوں نے عرض کیا۔ اسے سنا نہیں۔ ابھی ابھی ماتھے کی آنکھ سے دیکھا ہے تو فرمایا جب میں نے یہ دیکھا کہ دیوار پرانی ہے تو خیال آیا کہ ہو سکتا ہے۔ اس نے رسول کا زمانہ پایا ہو۔ اور جب زمانہ پایا ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ ادھر سے کبھی جان رحمت صلے اللہ علیہ وسلم گذرے بھی ہوں۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے چلتے، پھرتے آقائے دوجہاں نے اس پر اپنا دست کرم بھی رکھ دیا ہو۔ لہٰذا دیوار نہیں چومی جا رہی تھی نسبت مصطفےٰ کو بوسہ دے رہا تھا۔

اب اگر کوئی کہے کہ اس کو قرآن و حدیث میں دکھاؤ۔ کہ رب نے کہاں فرمایا کہ اسے چومو۔ تو اس کا صرف یہی جواب دیا جائے گا کہ ہم نے قرآن و حدیث کا دعویٰ ہی کہاں کیا ہے۔ یہ مسئلہ تو کتاب محبت کا ہے۔ لہٰذا اسے کتاب محبت اور عشق رسول کے باب میں دیکھا جائے۔

حضرت محمود غزنوی اپنے غلام ایاز کو بہت چاہتے تھے۔ اسی توسط سے اس کے بیٹے محمود سے پیار کرتے بلکہ محمود غزنوی ایاز کو اتنا چاہتے تھے کہ دوسرے درباریوں کو رشک ہونے لگا۔ اور یہ بات شدہ شدہ محمود غزنوی کے کان تک پہونچی۔ چنانچہ ایک مرتبہ محمود غزنوی نے دربار خاص طلب کیا اور شاہی خزانے کا ایک بہت ہی قیمتی پیالہ منگوایا۔ ایک درباری کو دے کر فرمایا اسے زمین پر گرا کر توڑ دو۔ درباری نے عرض کیا شہنشاہ! اس سے قیمتی پیالہ خزانۂ عامرہ میں نہیں ہے۔ لہٰذا ایسا نہ کیا جائے۔ فرمایا دوسرے کو دیدو۔

بادشاہ نے اس سے بھی یہی فرمایا۔ دوسرے درباری نے بھی وہی جواب دیا جو پہلے درباری نے دیا تھا۔ فرمایا تیسرے کو دیدو۔ غرضیکہ اسی طرح یہ پیالہ ہاتھوں ہاتھ گھومتا رہا مگر کسی نے توڑا نہیں۔ اب یہ پیالہ ایاز کے ہاتھ میں آگیا۔ بادشاہ نے اس کو بھی وہی حکم دیا کہ اسے توڑ ڈالو۔ بادشاہ کا حکم پاتے ہی اس نے ہاتھ سے چھوڑا۔ پیالہ زمین پر گرا۔ ایک آواز پیدا ہوئی اور پیالہ چکنا چور ہو گیا۔ بادشاہ نے بظاہر غضبناک آنکھوں سے دیکھا اور گرجتی آواز میں کہا، ایاز تجھے کیا ہو گیا۔ کسی نے بھی اسے نہیں توڑا۔ اور تو نے اتنے قیمتی پیالے کو توڑ دیا ایاز نے ڈرتے ڈرتے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ بادشاہ عالم پناہ! ان لوگوں نے پیالہ تو نہیں توڑا مگر آپ کا حکم توڑ ڈالا۔ صحیح ہے کہ میں نے پیالہ توڑ دیا مگر اس سے کہیں زیادہ قیمتی آپ کا حکم ہے۔ میں نے آپ کا حکم نہیں توڑا۔ حکم سلامت تو ایسے ہزاروں پیالے آسکتے ہیں۔

اب محمود غزنوی مسکرا اٹھا۔ اور کہا نادانو! تم لوگوں نے ایاز کا رنگ و روپ، کالا کلوٹا ہونا، اور سانولا پن دیکھا۔ مگر یہ نہیں دیکھا کہ کیسا زیرک و دانا اور عقیدت کا پتلا ہے۔ تم نے رنگ دیکھا میں نے اس کا ضمیر دیکھا۔

بہرحال! محمود غزنوی ایاز کی وجہ سے اس کے بیٹے محمد کو بھی پیار کرتا جب کوئی ضرورت پڑتی تو اس کے بیٹے محمد کا نام لے کر پکارتا۔ ایک روز محمود غزنوی کو وضو کے پانی کی ضرورت ہوئی تو پکارا اے ایاز کے بیٹے۔ کہیں سے ایاز نے سن لیا۔ دوڑا ہوا حاضر ہوا۔ بادشاہ سلامت! روزانہ تو اپنے غلام زادہ کا نام لے کر پکارتے تھے۔ آج کون سی خطا ہوئی کہ پیار کا وہ لب و لہجہ ختم ہو گیا۔ اور بجائے نام لینے کے پسر ایاز کہہ کر پکارا۔

محمود غزنوی نے جواب دیا، اس سے خطا نہیں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ تمہارے بیٹے کا نام محمد ہے۔ اور نام محمد بغیر وضو کے نہیں لیتا۔ اب اگر کوئی

محمود غزنوی سے پوچھے کہ یہ قرآن میں کہاں ہے۔ اور کس حدیث میں لکھا ہے کہ نام محمد بغیر وضو نہ لیا جائے تو اس کا یہی جواب ہو گا۔ میں نے قرآن وحدیث کا کب دعویٰ کیا ہے؟ یہ تو محبت رسول اور عشق مصطفےٰ کی ادا ہے۔ اسے کتاب محبت میں تلاش کرو۔ بخاری میں نہیں۔ محبت خود ایک دستور ہے عشق مستقل ایک ضابطہ ہے۔ یہ اسی قانون کی جزئیات وافراد ہیں۔

مجھے عرض کرنا یہی ہے کہ جیسا دعویٰ ہو ویسی دلیل مانگو۔

میلاد شریف، جلوس عید میلاد النبی، یہ سب ہماری محبت کی نشانیاں ہیں۔ لہٰذا دلیل میں قرآن وحدیث مت بولو۔ اسے کتاب عشق میں تلاش کرو۔ مگر عشق کی کتاب تو وہ اُلٹے جس کو اس کی حلاوت وچاشنی ملی ہو۔ جو عشق سے کورا ہو اس کی ہوا تک نہ لگی ہو بھلا وہ کتاب محبت کو کیسے الٹے گا۔ خمار کا اچھا شعر ہے ؎

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

حضرات! مقصد گفتگو یہ ہے کہ صرف دلیل کا طلب کرنا کمال نہیں ہے بلکہ ہوشمندی ودانائی سے سوال کرنا یہ بہادری ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ اس ضابطے کا دوسرا پیراگراف بھی سمجھا دیا جائے۔ پہلی بات یہ تھی کہ دلائل دو نہیں چار ہیں۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ دلیل کا فراہم کرنا، منکر قیام کی ذمہ داری ہے۔

اب سنبھل کر بیٹھئے اور اسے سماعت فرمائیے کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں بمبئی جیسے شہر کی طویل وعریض سڑکوں سے آپ گذرے جس پر نہ جانے کتنے چوراہے کتنے نلکے ملیں گے۔ جہاں پر ٹرافک پولیس سگنل دینے کو کھڑی ہے۔ میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ہر ہر چوراہے پر آپ پولیس

کی اجازت حاصل کر کے ہی آگے بڑھتے ہیں۔؟ ہرگز نہیں۔ چونکہ آپ جانتے ہیں کہ سڑک اسی لئے بنائی گئی ہے کہ ہر مسافر اس سے گذر جائے۔ سڑکوں میں کوئی جگہ ایسی ہوتی ہے کہ جہاں پہ تختی میونسپل بورڈ یا کارپوریشن کی طرف سے لگی رہتی ہے کہ "ڈینجر" خطرہ ہے۔ ادھر سے نہ گذریئے۔ کیا معلوم ہوا کہ روکنے اور منع کرنے کے لئے تختی تو لگائی گئی ہے مگر گذرنے کے لئے نہیں۔

دوسری مثال لیجئے! میں الٰہ آباد کا رہنے والا ہوں۔ صوبہ کا ہائی کورٹ وہیں ہے جس کی ہیبت عمارت سیکڑوں کمروں پر مشتمل ہے۔ ہر کمرے میں چلمن لٹک رہی ہے۔ آنے جانے والے چلمن اٹھائے آتے جاتے رہے۔ کسی بھی کمرے میں کہیں تختی نہیں لگی ہے کہ تشریف لایئے۔ مگر ان ہی کمروں میں بعض کمرے ایسے ہیں کہ جن کی پیشانی پر یہ لکھا ہے "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے"۔

کیا معلوم ہوا۔ جہاں روکنا مقصود ہوا وہاں تختی لگائی گئی۔ یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ "قیام" سے روکنے والے قیام نہ کرنے کے دلائل پیش کریں۔ قیام کرنے والے پر دلیل کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس لئے کہ رب نے میرے مصطفےٰ کے لئے فرمایا تعزروہ وتوقروہ۔ مصطفےٰ کی تعظیم و توقیر بجالاؤ۔

اس آیت سے مجھے قانون مل گیا ذات رسالت مآب موقر اور معظم ہے خدا ان کی توقیر و تعظیم بجالانے کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا تعظیم مصطفےٰ کے جتنے بھی افراد ہیں وہ سب اسی قانون کے پیٹ میں بیٹھے ہیں۔ توقیر و تعظیم کے جتنے بھی افراد ہیں وہ سب اسی قانون میں داخل ہیں۔ مقنن اصول کلی بناتا ہے۔ اگر قانون سخت ہوگا تو اس کو سمجھانے کے لئے وہ الگ مثالیں دیدیگا تاکہ ان مثالوں کی روشنی میں وہ قانون سمجھ میں آجائے۔

مثلاً دار العلوم غریب نواز کے شیخ الحدیث حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے ایک جماعت کو منطق کا سبق پڑھایا۔ اس میں انسان کی تعریف

بتائی کہ انسان جوہر، جسم، جسم نامی حساس متحرک بالارادہ اور ناطق کو کہتے ہیں یعنی جوہر ہو. عرض نہ ہو جسم ہو اور دیکھی بڑھنے والا جسم ہو حساس ہو. ارادہ سے حرکت کرتا ہو۔ اور معلومات کو ترتیب دے کر مجہولات کو حاصل کرتا ہو۔

مثلاً اس نے یہ ترتیب دیا اَلعَالَمُ مُتَغَیِّرٌ وَکُلُّ مُتَغَیِّرٍ حَادِثٌ فَالعَالَمُ حَادِثٌ یعنی عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہے پس یہ نتیجہ نکلا کہ عالم حادث ہے۔

اس قانون کو سمجھانے کے بعد آپ نے بطور مثال یہ کہا جیسے زید اور بکر لڑکوں نے مثبت انداز میں سر ہلایا۔ ہاں ہم نے سمجھ لیا۔ اسی اثنا میں خالد آ گیا۔ مولانا نے کہا یہ بھی انسان ہے۔ تو ایک بنگالی طالب علم بولا اے حضور ابھی تو آپ نے صرف زید بکر کا نام لیا تھا۔ خالد کا نام تو لیا نہیں تھا ہم تو اسے انسان نہیں کہیں گے۔ تو مولانا نے سمجھایا کہ اے نادان! اب اس کے معنی تو یہ ہوئے دنیا بھر کے جتنے انسان ہیں میں ایک ایک کر کے سب کا نام لوں اور جن کا نام نہیں لوں گا تو تو اسے انسان ہی نہیں کہے گا۔ تب تو ساری عمر میری اسی مردم شماری میں گذر جائے گی۔

اچھا یہ تو بتاؤ کہ میں نے تیرا بھی نام نہیں لیا تھا۔ تو انسان ہے کہ نہیں؟ یہاں نتیجہ یہ نکلا کہ مقنن کا کام ہے قانون بنانا۔ اور اس کے افراد کو حسب ضرورت گھیرنا' یہ ہماری ذمہ داری ہے۔

بس ایسے ہی خدا نے فرما دیا کہ میرے محبوب کی تعظیم بجا لاؤ۔ اب قرآن کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کی تمام تفصیلات کو بتلائے۔ یہ ہمارے تمہارے سپرد ہے۔ لہٰذا جب ذاتِ مصطفیٰ موقر و معظم ٹھہری، قابل تعظیم قرار پائی۔ اور قیام میلاد میں عظمت ہی کا تو تصور ہے۔ لہٰذا قیام کرنے والا دلیل نہ دے گا۔ بس اس کے لئے یہ عام قانون بہت کافی ہے۔ کہ

جناب رسالت مآب موقر و معظم ہیں۔ البتہ منکر قیام دلیل لائے کہ میلاد میں قیام کیوں نہ کیا جائے۔ یہ ذمہ داری قیام تعظیم کرنے والے کی نہیں ہے۔ بلکہ منکرین قیام کی ہے۔

یہی میں نے کہا تھا کہ منکر دلیل لائے گا۔ چونکہ عام ضابطے پر دلیل نہیں قائم کی جاتی۔ اگر ایسا ہو تو دور لازم آئے گا یا تسلسل۔ اور یہ دونوں، محال ہیں۔ لہٰذا مسلمات پر دلیل کا طلب کرنا ان دونوں استحالوں میں سے کسی ایک کو دعوت دینا ہے۔ اور محال کا واقع ہونا خود امر محال ہے۔

مگر یہ قوم رسول دشمنی میں اندھی ہو چکی ہے۔ اور بہت ہی ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوئی ہے۔ اس واضح اور مکمل گفتگو کے بعد اگر کوئی کہے کہ ہم میلاد و قیام مان لینے کو تیار ہیں مگر کوئی ہم کو قرآن میں یہ دکھائے کہ رسول اللہ کا میلاد کرو اور قیام کرو۔

جناب! اگر آپ کے اس طریقۂ سوال کو مان لیا جائے اور اس طرح کے سوالات کی گنجائش پیدا کر دی جائے تو یاد رہے کہ قرآن اصول کی کتاب نہ رہ جائے گی۔ اور آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ہر دلیل کے طلب کرنے میں اسی طرح کا سوال کرنا درست ٹھہرے تو قرآن تیس پاروں میں نہیں تیس ہزار پاروں میں بھی ہو جب بھی آپ کی نظر میں نامکمل رہ جاتا۔

اس سوال کا بوگس ہونا یوں سمجھیے۔ مثلاً ایک صاحب کسی بڑی درسگاہ سے فارغ ہو کر آئے چودہ گز کی نہیں سولہ گز کی پگڑی باندھ کر ایک فٹ کی نہیں ۴½ ساڑھے چار فٹ کی سند لے کر آئے جبہ اتنا لمبا چوڑا کہ اس کے دائیں بائیں گوشوں کو سنبھالنے کے لئے دو آدمیوں کی ڈیوٹی۔ اب یہ بڑے مولانا صاحب ایک دفعہ بازار جانے لگے۔ بوڑھی ماں نے کہا بیٹا! ایک نظر مجھے بھی دیکھو۔ سر کا دوپٹہ ریزہ ریزہ ہو کر چیتھڑا ہو گیا ہے۔ آنے لگنا تو اپنی

بوڑھی ماں کے لئے ایک دوپٹہ لیتے آنا۔ بڑی درس گاہ کا پڑھا لکھا، ایسی درس گاہ جہاں رسول خدا کو بھی اردو پڑھائی جائے۔ اس نے جواب دیا۔ ایک نہیں ایک درجن لا دوں گا مگر قرآن میں کہیں دکھا دو کہ جب ماں دوپٹہ مانگے، تو بیٹے کو لانا چاہئے۔ بولو پڑھا لکھا کہو گے یا گنوار اور جاہل۔ جاہل نہیں ابوجہل بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ گھاس کاٹنے بھاڑ جھونکنے والا اس ظالم سے پوچھو کہ پڑھنے گیا تھا یا ٹوکرا اٹھانے؟ ایسے ہی دوسرے مولانا سے ماں نے کہا بیٹا! نزلہ ہو گیا ہے۔ بازار جا رہے ہو جوشاندہ لیتے آنا بیٹے نے کہا جوشاندہ میں تو برگ گاؤزبان، گل بنفشہ، خطمی، عناب ولایتی یہ سبھی کچھ ہیں مگر ماں قرآن میں کہاں ہے؟ ہم تو وہی کرتے ہیں جو قرآن میں دیکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ میلاد و قیام رسول بھی نہیں کرتے۔ چونکہ قرآن میں نہیں دیکھا۔

ماں نے کہا بیٹا پنکھا لاؤ۔ بیٹے نے کہا قرآن میں پنکھے کا تذکرہ کہاں ہے وہ مانگو جس کا ذکر قرآن میں ہو۔ ماں نے کہا بیٹا! پیاس کی شدت ہے شربت روح افزا لاؤ۔ کہا فوراً ہمدرد دواخانہ اٹھا لاؤں مگر یہ تو بتاؤ اس کا ذکر قرآن میں کہاں ہے؟ شربت روح افزا کا نسخہ قرآن میں کہاں پس اسی پر قیاس کرتے چلے جائیے۔ میں یہی آپ سے عرض کر رہا تھا کہ اگر قرآن سے دلیل مانگنے کا یہی طریقہ اختیار کیا جائے تو قرآن اصول کی کتاب نہ رہ جائے بلکہ بنیوں کا بہی کھاتہ ہو کر رہ جائے۔ جس میں دھیلا چھدام سب لکھا جاتا ہے

حضرات اس سلسلے میں اب میں خود آپ سے ایک سوال کرنے جا رہا ہوں بس آپ کا جواب، اس بحث کا خاتمہ کر دے گا۔ سوال سمجھ کر سنئے۔ تاکہ سمجھ کر جواب دیجئے۔ بستر علالت پہ ایک بوڑھی ماں جو انتہائی کرب و اضطراب میں کروٹ بدل رہی ہے جیسا کہ بن پانی مچھلی تڑپے یہی اس کا حال ہے۔ کسی کروٹ چین نہیں۔ شب گذرتی جا رہی ہے، رات ڈھلتی جا رہی ہے مگر آنکھوں سے نیند رخصت ہو چکی ہے۔ دور دور تک اس کا پتہ نہیں۔

اور سعادت مند بیٹا جو بریلی شریف کا پڑھا ہوا ہے وہ ماں کو پنکھا جھل رہا ہے۔ کراہتے ہوئے ماں نے بیٹے سے پانی مانگا۔ بیٹا! ایک گلاس پانی لاؤ حلق سے کچھ بوندیں اتر جائیں شاید کہ تسلی ہو جائے۔ حکم پاتے ہی بیٹا آگے بڑھا۔ صراحی کے قریب آیا۔ گلاس میں پانی انڈیلا۔ اور لے کر ماں کے پاس آ گیا۔ اب کیا دیکھتا ہے کہ اتنے ہی وقفہ میں ماں کو نیند آ گئی ہے۔ اب بیٹا اس سوچ میں پڑ گیا کہ ماں کو جگائے یا پانی پلائے۔ عقل نے فیصلہ کیا کہ پانی پلانے کا بھی مقصد یہی تھا کہ ان کو سکون مل جائے اور نیند آ جائے اس کی نیند بہت قیمتی ہے بہت پیاری ہے۔ لہٰذا اسے جگایا نہ جائے سونے دیا جائے۔

چنانچہ خوش بخت، خوش نصیب بچہ ایک ہاتھ میں گلاس لیتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے پنکھا جھلتا ہے۔ وہ کہیں جاتا نہیں اس اندیشہ سے کہ کہیں مجھے نہ پا کر ماں کا کلیجہ نہ پھٹ جائے۔ پنکھا جھل رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ماں نے کروٹ لی۔ آنکھ کھل گئی۔ دیکھا بیٹا گلاس لئے کھڑا ہے۔ ماں نے کراہتے ہوئے پوچھا بیٹا! کیا ساری رات جاگتے ہی رہ گئے۔ سوئے نہیں؟

بیٹے نے جواب دیا آج کی رات سونے کے لئے نہیں جنت بنانے کی رات ہے۔ میں تو ایک ہی رات جگا۔ میری خاطر تم نے تو نہ جانے کتنی راتیں قربان کیں۔ اگر میں چوک گیا، تو ساری رات کلیجہ سے لگائے بیٹھی رہیں۔ یہ وہی ماں ہے جس کے لئے سرکار نے فرمایا۔

جوانو! تمہاری جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اب سارا مجمع جواب دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ اب سب لوگ بتاؤ۔ اس بیٹے نے اچھا کیا یا برا؟ کہیں شرک بدعت کا مرتکب تو نہیں ہوا؟ سنبھل کر جواب دیجئے۔ بیک آواز اچھا کام کیا۔ اچھا کام کیا۔ کیا آپ لوگ اسے قرآن میں دکھا سکتے ہیں۔؟ اچھا قرآن میں نہیں حدیث ہی میں دکھلا دیجئے۔ ایسا بھی

کیا کہ نہ تو قرآن میں ہے اور نہ ہی حدیث میں مگر پھر بھی اچھا

یہ جو بات میں نے کہی کہ بوڑھی ماں بستر علالت پر تڑپ رہی ہے۔ بیٹا بیقرار ماں نے پانی مانگا۔ بیٹا پانی لینے گیا اور آگیا۔ ماں کو نیند آگئی۔ بیٹا پانی کا گلاس ہاتھ میں لئے پنکھا جھلتا رہا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ نہ تو کسی آیت کا ترجمہ ہے اور نہ ہی کسی حدیث کا۔ اب بھی سنبھل جائیے۔ اچھا کام ہو یا برا؟ اچھا، اچھا، اچھا۔

معلوم ہوا کہ اس کی صراحت، اس طرح نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں مگر ماں کے بارے میں، ہم شریعت کا حکم جانتے ہیں کہ بیٹے کی ذمہ داری ہے کہ وہ ماں کو آرام پہنچائے۔ ماں کی اطاعت کرے۔ بس یہ ہے قرآن کا کھلا ہوا قانون۔

لہٰذا اب اطاعت اور آرام پہنچانے کے جتنے بھی افراد ہیں۔ وہ سب کے سب اسی قانون میں شامل ہیں۔ قرآن یہ نہیں کہے گا کہ ماں کے لئے روح افزا شربت لاؤ۔ قرآن اس کا نسخہ نہیں بتلائے گا۔ قرآن یہ نہیں کہے گا۔ ماں کے لئے پنکھا لاؤ، قرآن یہ نہیں کہے گا دوپٹہ لاؤ۔ جوشاندہ لاؤ۔ بس قرآن نے ایک عام قانون دے دیا کہ ماں مطاع ہے۔ اور معظم ہے۔ اس کی اطاعت کرو۔ آرام پہنچاؤ۔ وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ تک کا قانون کہ ماں باپ کو اُف تک نہ کہو ۔ اب اگر تم ہوشمند ہو تو اس کا پتہ لگاؤ کہ ماں کا آرام کن کن چیزوں میں ہے۔

بس ایسے ہی پروردگار نے فرمایا "وتعزروہ وتوقروہ" مصطفیٰ موقر اور معظم ہیں لہٰذا قابل تعظیم ہیں تو افراد تعظیم کی دلیل ہم کو نہ دینی پڑے گی۔ بلکہ جو اس کا منکر ہو گا دلیل اسے لانی پڑے گی۔ چونکہ عام قانون سے، جب کوئی دفعہ مستثنیٰ کی جاتی ہے تو مستثنیٰ منہ پر دلیل نہیں قائم کی جاتی۔ بلکہ مستثنیٰ پر قائم کی جاتی ہے یہی میرا مدعا تھا کہ قیام کرنے

والا دلیل نہ دے گا۔ بلکہ اس کا منکر دلیل لائے گا۔

فالحمد للہ علی ذالک۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم

صحیح عقائد مدارِ نجات ہیں اعمال مدارِ نجات نہیں

عقیدہ و ایمان ایک ایسا مضبوط ستون ہے جس پر پورے اعمال کی عمارت قائم ہے۔ اگر عقیدے میں کسی طرح کا نقص پیدا ہوا تو عمارتِ اعمال ریت کی دیوار سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہو گی۔ درستگیٔ عقیدہ کے بغیر قبولیت عمل کا تصور ہواؤں میں محل تعمیر کرنے کے مترادف ہے چونکہ ایمان عمل پر مقدم ہے۔

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے سے
ہزاروں برس گو سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

بغیر کسی تاخیر کے ورق الٹیے اور دیدۂ دل وا کیجیے

پھر

پڑھیے۔

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ حبیبہ الذی اصطفیٰ

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ کَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے:

صحیح عقائد مدارِ نجات ہیں اعمال مدارِ نجات نہیں

آج کی تقریر بنیادی ذہن دفن کر دینے والی ہے یہی ایک ایسا ستون ہے جس پر اعمال و افعال کی پوری عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اگر ایمان و عقیدے سلامت تو ہر عمل صالح و سلامت۔ اس کا حال بقیہ اس شعر کے مطابق ہے۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

مجھے یہ سمجھانا ہے کہ ہماری اور آپ کی اسلامی زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ عقیدہ اور عمل۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمیں اور آپ

کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ان میں ایمان و عقیدہ مقدم ہے یا عمل۔؟

حضرات! میں پہیلی بجھانا نہیں چاہتا۔ پہلے ہی مرحلے میں واضح کئے دیتا ہوں کہ ان دونوں میں ایمان و عقیدہ مقدم ہے اور عمل بعد میں۔

مثلاً ابھی ایک غیر مسلم اجلاس کے اس حاشیہ پر اعلان کرے کہ بھائیو! ہم برسوں اس کا ریسرچ و تحقیق کرتے رہے کہ اس روئے زمین پر سب سے زیادہ سچا اور صحیح مذہب کون سا ہے؟ تو اب مجھ پر یہ حقیقت منکشف و آشکارا ہو گئی کہ اس لمبی چوڑی زمین پر سب سے زیادہ قابل قبول اور پسندیدہ مذہب، مذہب اسلام ہے۔ لہٰذا میں اب سب لوگوں کو گواہ بنا کر مسلمان ہونا چاہتا ہوں آپ لوگ بلا تاخیر مجھے مسلمان کر لیجئے تو کیا رئیس ملت مولانا عبدالحمید صاحب رضوی یہ فرمائیں گے کہ ابھی عشا کا وقت ہے فوراً وضو کر لے اور نماز پڑھ لے! ہرگز نہیں۔ کیا مولانا عبدالحمید صاحب یہ فرمائیں گے کہ میں تجھے جانتا ہوں۔ بہت بڑا دولت مند ہے۔ بینک بیلنس ہے۔ لہٰذا زکوٰۃ ادا کرے؟ ہرگز نہیں۔

کیا مولانا رضوی یہ فرمائیں گے کہ حج کا پاسپورٹ بن رہا ہے تو فوراً پاسپورٹ بنوا کے حج ادا کرے؟ ہرگز نہیں۔ یہ فرمائیں گے تو مالک نصاب ہے پہلے زکوٰۃ دیدے ہرگز نہیں۔

کیا معلوم ہوا یہ سب ہی کے سب ارکان اسلام ہیں۔ ان میں سے ابھی کسی کو بھی ادا نہ کیا جائے گا۔ پہلے ہاتھوں سے دامن مصطفےٰ تھاما جائے۔ اقرار توحید و رسالت سے پہلے دل کا زنگ دور کر لیا جائے۔ اولاً شمع ایمان روشن کیا جائے پھر اس کی روشنی میں سجدہ کیا جائے۔

یہی میرا کہنا ہے کہ اسلام میں اگر کوئی داخلہ لیتا ہے تو پہلے اس کے ہاتھوں میں اللہ کے رسول سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دامنِ کرم دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ان کو مانے گا تو اسلام کا ہر فرمان مانے گا۔ اور جب انھیں کو نہیں مانے گا تو نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ کو کیا مانے گا۔؟ پہلے خدا کا سجدہ نہیں کرایا جاتا بلکہ دل کی دنیا کو نورِ مصطفیٰ سے معمور کیا جاتا ہے۔

حضرات! جب ماننے کی بات آئی ہے تو برسرِ راہ ایک بات عرض کرتا چلوں کسی بھی گفتگو سے پہلے اس کا فیصلہ کر لینا ضروری ہے کہ منصبِ نبوت جاننے پہچاننے کا ہے یا ماننے کا۔

حضرات! یہ حقیقت واضح رہے کہ نبی و رسول کو صرف جانا پہچانا نہیں جاتا بلکہ انھیں مانا جاتا ہے اور یہی ایمان و کفر کا حدِ فاصل اور نشانِ امتیاز ہے۔

اب اس اصول کو ایک بہت ہی منھ بولتی مثال میں سمجھیں عہدِ رسالت ہے۔ دو کافر سفیان اور صفوان حالتِ کفر میں مکہ میں کھڑے ہیں اور اپنے ماتھے کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہرن کو بھیڑیا شکار کی غرض سے دوڑا رہا ہے اور ہرن جان بچا کر بھاگا جا رہا ہے۔ اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ مکہ مکرمہ کی زمین دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے ایک کا نام "حل" ہے اور دوسرے کا "حرم"۔ "حل" مکہ مکرمہ کے اس خطۂ ارض کو کہتے ہیں جہاں شکار کرنا درست ہے۔ اور "حرم"، اس خطۂ ارض کو کہتے ہیں جہاں شکار کرنا حرام ہے۔ یہ دونوں کافر سفیان اور صفوان، بھیڑیا اور ہرن کا دوڑنا بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک یہ دیکھا کہ جیسے ہی ہرن نے "حرم" میں قدم رکھا جہاں شکار حرام ہے بس ویسے ہی

بھیڑیا رک گیا۔ گویا کسی نے پاؤں میں آہنی بیڑی ڈالدی ہو۔

یہ دیکھ کر صفوان نے سفیان سے کہا مجھے بہت ہی حیرت اور تعجب ہے کہ کیا ایک بھیڑیا بھی جانتا ہے کہ کہاں شکار کرنا چاہیے اور کہاں نہیں کرنا چاہیے۔؟

خدائے قادر مطلق نے بھیڑیے کو قوت گویائی عطا فرمائی۔ اور اس نے پلٹ کر جواب دیا۔ اے لوگو! تمہاری حیرانی اس بات پر ہے کہ میں 'حل' اور 'حرم' کو پہچانتا ہوں اور میری حیرانی اس بات پر ہے کہ تم غیب بتانے والے محمد رسول اللہ کو نہیں پہچانتے؟ یہ سن کر صفوان نے سفیان سے کہا، اے سفیان کیا اب بھی تمہیں محمد صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نبی و رسول ہونے میں شک و شبہ ہے؟ سفیان نے حالت کفر میں جواب دیا کہ اے صفوان آج نہیں آج سے بہت دنوں پہلے سے جانتا ہوں کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نبی و رسول ہیں۔

حضرات! غور فرمائیے، سفیان کہہ رہا ہے کہ میں بہت دنوں سے جانتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی و رسول ہیں لیکن میں نے انہیں اپنا۔ نہیں سمجھا۔ نہ انہیں گلے لگایا۔ نہ ہی ان کے لیے مسجد کا دروازہ کھولا۔ وہ گیا کافر کا کافر۔

معلوم ہوا کہ نبی کو محض جاننا پہچاننا نہیں جاتا اگر محض جاننا پہچاننا کافی ہوتا تو سفیان زمرہ اسلام میں داخل ہو گیا ہوتا۔ بلکہ نبی کا منصب یہ ہے کہ اسے مانا جائے۔ جاننا اور ہے ماننا اور ہے ماننے کا تعلق دل اور صرف دل سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان کا تعلق کھوپڑی اور عقل سے نہیں رکھا گیا۔ عقل مانے یا نہ مانے دل اس کی گواہی دیدے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمدا

عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ اسی لئے ایمان کہتے ہیں:

"تصدیق بما جاء بہ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے اس کی تصدیق کرنا اسی کا نام ایمان ہے۔"

ایک نکتہ:۔ ایک بہت ہی لطیف اور باریک سی بات ہے کہ اگر ایمان کا تعلق عقل سے ہوتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ عقل جسے تسلیم کرتی اسی کو ہم بھی تسلیم کرتے اور عقل جسے رد وانکار کر دیتی تو اسے ہم بھی رد کر دیتے۔ تو اس کا واضح اور صریح مطلب یہ ہوتا کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لائے بلکہ پہلے اپنی عقل کو مانا پھر ثانوی مرتبے میں عقل نے جسے مانا تب اسے ہم نے مانا۔ گویا اللہ اور اللہ کے رسول کو اول مرتبہ میں نہ مانا بلکہ ہر فرمان کو پہلے عقل کی ترازو پر تولا جاتا۔ اگر وہ اسے تسلیم کر لیتی تب تو اس پر ایمان لایا جاتا۔ اور اگر وہ نہ تسلیم کرتی تو ایمان نہ لایا جاتا۔

اس لئے اسلام نے اس میں عقل کو راہ نہیں دیا۔ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے ایک مومن کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قال اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قال رسول اللہ، رسول اللہ نے فرمایا۔ اللہ اور رسول اللہ کے فرمانے پر تسلیم کرنے کے لئے ہمیں کوئی دلیل نہیں مانگنی ہے۔ سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ خدا نے فرمایا اور مصطفیٰ نے فرمایا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

دوسرا نکتہ:۔ ایک مقلد ہونے کے لحاظ سے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قول امام کو بلا دلیل ماننا۔ اسی کو تقلید

کہتے ہیں جب امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہم بحیثیت مقلد بلا دلیل تسلیم کرتے ہیں۔ یہ یقین رکھتے ہوئے کہ امام نے جو کچھ فرمایا ہے قرآن وسنت کی روشنی میں فرمایا ہے۔ یہ ان کی اپنی بات نہیں بلکہ قرآن وحدیث کے وہ اسرار ورموز جہاں تک مقلد کی آنکھ نہیں پہنچتی وہاں امام اور مجتہد کی آنکھ کام کرتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی قیاسی مسئلہ میں ایک مقلد کے لئے یہ کہدینا بہت کافی ہے کہ قال ابو حنیفہ۔ ابو حنیفہ نے فرمایا اب اس کے بعد وہ دلیل نہیں مانگتا کہ ابو حنیفہ نے کیوں کہا کیسے کہا۔

بھلا بتائیے جب امام ابو حنیفہ کا قول دلیل نہ جانتے ہوئے تسلیم کیا جاتا ہے اور اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ قول امام ابو حنیفہ کا ہے تو اللہ اور اللہ کے رسول کے فرمان اور حکم پر کیسے دلیل مانگی جاسکتی ہے۔ جب تقلید کی شان یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کا نام لے لینا کافی ہے تو ایک مومن کے حق میں بس یہ کہدینا بہت کافی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے فرمایا ہے۔

حضرات! یہ ایک ذیلی گفتگو آگئی تھی جس میں، میں الجھ کر رہ گیا۔ گفتگو یہ چل رہی تھی کہ منصب نبوت جاننے کا نہیں، ماننے کا ہے لہٰذا اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے ہر ایک کی مثال ایسی دیدی جائے جس سے ماننے کی حقیقت روشن ہوجائے۔

حضرات! ایک بار آقائے دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی یہودی سے ایک گھوڑا خریدا۔ معاملہ طے ہوجانے کے بعد فرمایا قیمت آکر لے جانا۔ چنانچہ جب وہ دربار نبوی میں حاضر ہوا تو اس سے زیادہ کا مطالبہ کیا۔ جتنے میں اس نے فروخت کیا تھا۔ سرکار نے فرمایا تم نے اتنے میں نہیں بیچا بلکہ اتنے میں بیچا ہے مگر وہ مانتا نہیں تھا۔ اپنی بات پر مُصر اور اَڑا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک

صحابی "خزیمہ" کھڑے ہو گئے۔ عرض کیا۔ یارسول اللہ! آپ جو کچھ فرماتے ہیں سچ فرما رہے ہیں۔ آقائے دوجہاں نے فرمایا تم کیسے گواہی دے رہے ہو۔ گواہ تو وہ بن سکتا تھا جو معاملے کے وقت موجود ہوتا۔

حضرات! اگر کوئی دنیادار لیڈر و منسٹر ہوتا تو یہ سن کر اس کی باچھیں کھل جاتیں اور ڈوبتے کو تنکا سہارا سمجھ کر اسے اپنا گواہ بنالیتا تو جناب اب تنہا میری بات نہ رہی اب تو ایک گواہ بھی مل گیا ہے مگر نبی لیڈر نہیں ہوتا، ہادی ہوتا ہے۔ اگر آڑے وقت اپنی ضرورتوں کے پیش نظر وہی ایسے ہتھیار استعمال کرے تو قوم کی لٹیا ڈوب جائے اس کا ہر نقش قدم پتھر کی لکیر اور تاریکیوں کا اجالا ہوتا ہے۔

سرکار نے ان صحابی "خزیمہ" سے فرمایا جب تم اس وقت موجود نہیں تھے تو کیسے گواہی دے رہے ہو عرض کیا یارسول اللہ! یہ صحیح ہے کہ میں اس وقت موجود نہیں تھا مگر اے میرے سرکار! اگر ہر معاملہ میں دیکھنا اور موجود ہونا ہی ضروری ہو تو آپ نے فرمایا "جنت" ہم دیکھے نہیں مگر ایمان لائے۔ آپ نے فرمایا "دوزخ" ہم دیکھے نہیں مگر ایمان لائے۔ آپ نے فرمایا "صراط" دیکھے نہیں، مگر ایمان لائے۔ آپ نے فرمایا "قیامت" ہم دیکھے نہیں مگر ایمان لائے۔ جب بغیر دیکھے ہم جنت و دوزخ، میزان و ترازو، کوثر و پل صراط پر ایمان لاسکتے ہیں تو بھلا ایک گھوڑے کے لین دین پر آپ کی بات ہم کیوں نہیں مان سکتے۔ یارسول اللہ! اب ہمارا معاملہ آپ کے بارے میں دیکھنے پر موقوف نہیں رہ گیا۔ جب آپ پر ایمان لائے تو آپ کی ہر ہر بات پر ایمان لانا ہے۔

حضرات! یہ ہے ماننے کی شان! چنانچہ آقائے کائنات ان صحابی "خزیمہ" پر اس قدر خوش ہوئے کہ جس معاملے میں دو مسلمان

مرد کی گواہی ضروری ہوتی ہے۔ سرکار نے فرمایا وہاں تنہا اکیلے "خزیمہ" کی گواہی کافی ہو جائے گی۔ ان کی ایک گواہی دو گواہوں کے برابر ہوگی۔ صلاۃ وسلامنا علیک یارسول اللہ۔

حضرات! اب تو یہ بات آپ پر واضح ہوگئی کہ جاننا کیا ہے اور ماننا کیا ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ "نبی" مجبور نہیں ہوتا بلکہ مختار ہوتا ہے۔ اگر اس کے اختیارات سے انکار کر دیا تو شریعت کی روشن وتابناک عمارت بالکل بے رونق وبے نور ہو جائے، دن کے اجالے میں بھی انکھیارے کو اندھیرا ہی سوجھے۔

حضرات! یہ میرا عنوان تو نہیں ہے مگر اختیار کی بات آہی گئی ہے تو ایک واقعہ اور سماعت فرمائیں:۔

ایک بار آقائے دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم رونق افروز ہیں۔ ایک صحابی سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے دربار گہر بار میں حاضر آئے اور اعتراف گناہ کرتے ہوئے اپنے گناہ کا کفارہ دریافت کیا۔

حضرات! ذرا غور تو فرمائیے! پندرہویں صدی اور عہد صحابہ میں کتنا فرق ہے۔ آج اگر ہم سے اور آپ سے گناہ ہوتا ہے تو ہم لوگ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ اور صرف چھپاتے ہی نہیں بلکہ جھوٹے گواہوں سے کورٹ میں گواہی تک دلاتے ہیں۔ خود بھی جھوٹ بولیں اور دوسروں سے بھی جھوٹ بلوائیں۔ یہ ہمارا حال ہے۔ اور صحابہ کا حال یہ تھا کہ اگر کمائی کوشری میں بشریت کی کوئی خطا ہو جائے تو دنیا ہی میں اس کی تطہیر وپاکیزگی چاہتے۔ تاکہ کل خدا کے حضور شرمندہ وشرمسار نہ ہونا پڑے۔ اور اس سے آخرت کی سزا وجزا کا یقین اور خشیت الٰہی سے دلوں کے معمور ہونے کا بخوبی اندازہ

ہو جائے۔

حضرات! وہ نور و نکہت کا زمانہ تھا۔ آج جو ہزار ہا کتابوں کے بے شمار صفحات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتا اس سے کہیں زائد وہ جمال مصطفےٰ کے صحیفہ انور کی تلاوت سے ملتا تھا۔

حضرات! میں اختیار مصطفےٰ سے متعلق ایک گوشہ عرض کر رہا تھا کہ ایک صحابی نے سرکار کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اعتراف خطا کیا اور اپنے گناہ کا کفارہ دریافت کیا۔ سرور عالم روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ایک غلام آزاد کرو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اتنی وسعت نہیں ہے۔ سرکار نے فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ عرض کیا یا رسول اللہ میں اس کا بھی اہل نہیں کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکوں۔ سرکار نے ارشاد فرمایا، مسلسل ساٹھ روزے رکھو۔ عرض کیا یا رسول اللہ اس پر بھی قدرت نہیں۔ سرکار ابھی فرما ہی رہے تھے کہ اتنے میں کچھ کھجوریں خدمت میں پیش کی گئیں۔ سرکار نے فرمایا اچھا ایسا کرو۔ جاؤ ان کھجوروں کو مدینہ کی گلیوں میں مسکینوں کو تقسیم کر دو یہی تمہارے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا۔ صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! مدینہ میں مجھ سے بڑا مسکین کون ہے؟ سب سے بڑا مسکین تو میں ہی ہوں۔ سرور عالم روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اچھا جاؤ ان کھجوروں کو کھالو۔ یہی تمہارے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا۔

اب اس سے زیادہ نبی کے مختار و مجاز ہونے کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے، کہ گناہ بھی سرزد ہو اور منہ بھی میٹھا کرایا جائے۔ معذرت چاہتے ہوئے گذارش کروں گا کہ پھر اسی نقطۂ آغاز پر آجائیے جہاں سے ہم نے رخت سفر باندھا تھا کہ ایمان

عمل پر مقدم ہے۔ پہلے کسی کے ہاتھ میں دامنِ مصطفےٰ دیا جاتا ہے۔ تب اس سے نماز و روزے، حج و زکوٰۃ کا عہد و پیمان لیا جاتا ہے پہلے خدا کی بارگاہ میں پیشانی نہیں جھکوائی جاتی بلکہ دل جھکوایا جاتا ہے جب دل مان لیتا ہے تو محبوب کی ہر ہر ادا پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے سرکار نے پہلے سجدہ نہیں کروایا، سب سے پہلے اپنے کو منوایا ہے۔ چونکہ سرکار خدا اور بندوں کے درمیان رابطہ اور وسیلہ ہیں۔ لہٰذا خدا اور اس کی وحدانیت کی سب سے بڑی دلیل محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہیں گویا لا الٰہ الا اللہ ایک دعویٰ ہے۔ اور محمد رسول اللہ اس دعوے کی سب سے زیادہ اہم مضبوط روشن و تابناک اور ناقابلِ انکار دلیل ہے۔ ایسی دلیل جہاں سب نے گھٹنے ٹیک دیئے۔

سوال :۔ حضرات بہت سے لوگ یہاں ایک سوال کرتے ہیں کہ جو لوگ میلاد و سلام، نیاز و فاتحہ وغیرہ کے قائل نہیں وہ لوگ بھی تو دلیل میں قرآن ہی پیش کرتے ہیں؟

جواب :۔ حضرات! صرف ہاتھ میں قرآن کا لینا اور زبان سے اس کی تلاوت کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ یہی تو ابھی میرا موضوع چل رہا ہے، کہ جاننا اور ہے ماننا اور ہے۔ یہ دنیا جاننے کی نہیں ماننے کی ہے۔

اب آپ دور نہ جائیے۔ میں اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے آپ کو دور نہ لے جاؤں گا اسی ملک کی ایک مثال دیتا ہوں آپ نے پنڈت سندر لال کا نام سنا ہوگا وہ سیرتِ نبوی پر مسلسل گھنٹوں بولتا ہے۔ سرکار کی مکی زندگی، مدنی زندگی، عائلی زندگی، اخلاقِ نبوت، غزوات مصطفےٰ وغیرہ وغیرہ۔ اور لنگڑی لولی

اردو نہیں بلکہ گویا کوثر و تسنیم کی دھلی دھلائی صاف، سائشتہ، شستہ و شگفتہ اردو جس کی ہر نوک و پلک درست ہے اور وہ اپنے بھاشن نثر و بیان میں بطور حوالہ گیتا اور راماین کے حوالے نہیں دیتا نہ اس کا کوئی اشلوک پیش کرتا ہے اور نہ کہیں کی چوپائی۔ بلکہ آیات قرآنی کا حوالہ دیتا ہے۔

مجھے کہنے دیجئے اگر اسلام کی نظر میں قرآن پڑھ لینا کافی ہوتا تو اسے پنڈت نہیں مولانا و علامہ کہا جاتا سندر لال نہیں عبد اللہ کہا جاتا۔ مگر قرآن کے پڑھنے کے باوجود وہ رہ گیا پنڈت کا پنڈت اور سندر لال کا سندر لال۔ نہ اسے مسلمان کہا گیا اور نہ ہی اس کے لئے بہشت کا دروازہ کھلا۔

معلوم ہوا اس نے قرآن تو ہاتھ میں لیا مگر اس کا ہاتھ دامن مصطفےٰ سے خالی رہا۔ پہلے ہاتھوں میں قرآن نہیں لیا جاتا بلکہ اس دامن کو مضبوطی سے تھاما جاتا ہے جس دامن والے کے توسط و وسیلہ سے تیس پارے کا قرآن ملا۔

یہی میرا کہنا ہے کہ قرآن و نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ سب پر مقدم ایمان ہے۔ اور ایمان کی روح و جان ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

حضرات! ابھی تک میں اپنے عنوان کی ایک بہت ہی طویل و لمبی تمہید میں الجھا ہوا ہوں، کہ ایمان عمل پر مقدم ہے۔ مضمون میرا یہ ہے کہ "صحیح عقائد مدارِ نجات ہیں، اعمال مدارِ نجات نہیں"! چنانچہ اس سلسلہ میں میں نے قرآن حکیم کی ایک آیت تلاوت کی ہے۔

حضرات! میں نے متعدد بار آپ کو یاد دلایا ہے کہ قرآنی آیات اور سورتوں اور ان کے ترجمے سے پیش تر ان کی شان نزول کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے۔ اگر اس میں ہم ٹھوکر کھا گئے تو ہدایت سے قریب آنے کے بجائے گمراہی کے دلدل میں پھنس جانے کا اندیشہ و خطرہ لگا رہے گا۔ لہٰذا میں نے جس آیت کی تلاوت کی ہے:

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ کَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ

اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارا نہ کوئی عذر سنا جائے گا نہ بہانہ قابلِ قبول ہوگا۔ ایمان لانے کے بعد تم کافر ہو چکے ہو۔

اب اس کی کسی بھی تشریح سے پہلے شانِ نزول سماعت فرمائیں

ایک بار آقائے کائنات روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم صحابۂ کرام کے ہمراہ کہیں سے گذر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک جاں نثار صحابی نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! نہ جانے میرا اونٹ کہاں گم ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی سرورِ عالم نے فرمایا تمہارا اونٹ فلاں جھاڑی میں الجھا ہوا ہے۔ ان میں ایک ایسا بھی تھا جو کھرا نہیں کھوٹا تھا اب وقت آ گیا کہ ایمان کی کسوٹی پر اسے پرکھا جائے۔ چنانچہ اس سے نہ رہا گیا وہ چرکٹ، دل کا اندھا بول پڑا۔ کیا محمد غیب بھی جانتے ہیں۔؟ بہت ہی حیرت واستعجاب اور تمسخر واستہزار کے لہجے میں بولا۔ یہ سنتے ہی صحابۂ کرام کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ تیوری چڑھ گئی اور بڑا انٹ کر سخت لب و لہجے میں

گرجتی آواز میں جب صحابہ بولے تو وہ بہانہ بازی کرنے لگا کہ اگر نہیں بولیں گے تو راستہ کیسے کٹے گا۔ اس کے کہتے ہی وحیِ الٰہی اتر گئی۔

خدائے تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ کَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ

تمہارا کوئی عذر اور بہانہ نہیں سُنا جائیگا تو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا۔

حضرات! چہرے پر داڑھی ہے، پیشانی پر نشانِ سجدہ، لب پر کلمہ ہے، دامن لمبا بھی، بظاہر سچا پکا نمازی ہے اور ایسا نمازی کہ رسول اللہ کی اقتدار میں سجدہ گذارا۔ لیکن بظاہر ایسے فرشتہ صفت کے لئے یہاں کا دارالافتار نہیں بلکہ اس احکم الحاکمین کا فیصلہ ناطق ہے کہ اب تو مسلمان ہی نہیں رہ گیا بلکہ کافر ہو گیا۔ چونکہ نبی کی بارگاہ کا گستاخ و بے ادب مسلمان نہیں بلکہ خارج از اسلام اور کافر ہوتا ہے۔

ایک بہت اہم سوال کا جواب:۔ آج گمراہوں کی طرف سے لوگوں کو ذہن دیا جارہا ہے کہ علمار بریلی ، علمائے اہلسنت "مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں۔

میں ان نااہلوں، زبان درازوں، ناعاقبت اندیشوں، اور حقیقت نا آشناؤں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ عالمِ بالا میں "بریلی" کا کونسا دارالافتار کھلا ہوا ہے۔؟ کیا مذکورہ آیت بھی معاذاللہ اسی دارالافتار کی ہے جو ایک کلمہ گو داڑھی والے نمازی کی تکفیر کر رہی ہے؟ ڈھکے چھپے لفظوں یا اشارے وکنائے کی اصطلاح میں نہیں بلکہ کھلم کھلا، علی الاعلان پوری صراحت بر لایت سے خدا کا حکم نازل ہے کہ ایسا گستاخ و بدزبان مسلمان نہیں رہا بلکہ کافر ہو گیا۔

کیا یہاں بھی خبط الحواس ، مالیخولیائی مریض یہ کہہ سکے گا کہ خدا تکفیر المسلمین کر رہا ہے۔؟ معاذاللہ مسلمانوں کو کافر بنا رہا ہے

حضرات! اسے بہت ہی ہوش گوش سے سماعت فرمائیے کھٹکنے کی بات آگئی ہے۔ میں خصوصی توجہ کا طلب گار ہوں۔

سوال:- آج ہم پر یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ ہم مسلمانوں کو معاذ اللہ، کافر بناتے ہیں۔

اگر یہ سوال کسی بھی رخ اور تاویل سے درست ہوجائے تو پھر کیا یہی الزام اسی تاویل کی روشنی و بنیاد پر خدا پر لگایا جاسکتا ہے کہ معاذ اللہ اس نے مسلمان کو کافر بنایا۔ صدبار معاذ اللہ۔ اگر کوئی سرپھرا ایسا مان لے تو پھر چشم ما روشن و دلِ ما شاد۔

تو گویا! ہم ایسا کرکے سنت الٰہیہ ادا کررہے ہیں اور کون ہے جو سنت الٰہیہ سے ہم کو روکے

نکتہ:- لہٰذا اب میں واضح کردینا چاہتا ہوں کہ کافر بنانا اور ہے کافر بتانا اور ہے۔ صرف ایک نقطہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آج علمائے اہلسنت پر یہی تو الزام ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں۔ اور ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہم کافر بتلاتے ہیں۔ بلکہ اپنے قول کفر سے جو واقعتاً کافر ہوچکا ہے ہم قوم کو اس کے کفر پر مطلع کرکے کافر بتلاتے ہیں، بناتے نہیں۔ اس لئے اپنے کفر کو اپنے علم، زہد و ورع، ظاہری تقویٰ و طہارت، نمائشی نماز و روزے میں چھپا رکھا تھا۔ اندیشہ تھا کہ اس ظاہری شکل و صورت کے فریب میں آکر کہیں قوم اس کا کفر قبول نہ کرلے۔ اس لئے علمائے اہلسنت کی دینی، شرعی اور مذہبی ذمہ داری تھی کہ حقیقت آشنا ہوتے ہوئے اس سادہ قوم کو جو ناآشنائے حقیقت تھی اس کو ان کے کفر پر مطلع کردے۔

ع ادنیٰ سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

حضرات! اگر بتانے کا نام بنانا رکھا جائے تو یہ الزام علمائے اہلسنت کے سر نہیں آتا۔ سب سے پہلے قرآن پر ہوگا۔ کہ قرآن مسلمان بنانے کے لئے اترا ہے یا کافر؟ اور معاذ اللہ خدا پر سوال ہوگا کہ وہ تکفیر المسلین کر رہا ہے۔

کلمہ گو ہے، نمازی ہے، سب کچھ ہے مگر قرآن کہتا ہے لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ کَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ تیرا اب کوئی بہانہ نہیں سنا جائے گا تو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا۔

معلوم ہوا جب تک اس نے تمسخر اور استہزاء نہیں کیا تھا قرآن نے اس پر ایسا کوئی حکم نہیں لگایا۔ مگر جیسے ہی اس نے علم مصطفےٰ سے تمسخر کیا، مذاق اڑایا، اس کا استہزاء کیا، گستاخی، اور بے ادبی کی، ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر جلال باری عتاب کی شکل میں نازل ہو گیا۔ اور صاف صاف کہدیا کہ علم غیب نبی کا مذاق اڑانے والا مسلمان نہیں بلکہ کافر ہوتا ہے۔

حضرات! آپ کو یہی کہنا پڑے گا کہ خدا نے کافر بنایا نہیں بلکہ جو علم غیب کا مذاق اڑا کے کافر ہو چکا تھا۔ خدائے ذوالجلال نے اس کی پردہ پوشی نہیں فرمائی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ جرم عام ہو جاتا اور جن کے دلوں میں "نبی" کی طرف سے چور اور کھوٹ ہوتا ہے وہ توہین کر کے اس کی غلط سلط تاویل کرنا چاہتے ہیں۔ خدا نے اس کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ اور صاف صاف اعلان فرما دیا کہ اس کا کوئی بہانہ قابل قبول نہیں۔ تو مسلمان نہیں کافر ہے۔ لہٰذا علمائے اہلسنت پر کافر بنانے کا الزام ہرگز ہرگز نہیں لگایا جا سکتا۔

حضرات! غور فرمائیں اس سے مزاجِ کفر کا پتہ چلتا ہے کہ

وہ ظالم اپنا جرم چھپانے کے لئے کتنی بھدی اور بھدّی تاویل کرتا ہے وہ کہتا کیا ہے "اگر نہیں بولیں گے تو راستہ کیسے کٹے گا"۔

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں اگر راستہ کٹنے کے لئے بولنا ہی ضروری تھا تو وہ سرکار کی تعریف کرتا۔ جب سرکار نے فرمایا تھا کہ تمہارے اونٹ کی نکیل جھاڑی میں الجھی ہوئی ہے تو انتہائی مسرت سے یہ کہنا چاہیے تھا سبحان اللہ کیا کہنا ہمارے نبی کا۔ ایسے عالم غیب ہیں کہ ہر ڈھکی چھپی چیزوں کو ملاحظہ کرتے ہیں یہ ہماری فیروز بختی و اقبال مندی ہے کہ ہم ایسے عالم غیب نبی پر ایمان لائے ہیں جو زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی شئے پر نگاہ رکھتا ہے۔ مگر اس کا یہ کتنا بدبختانہ کردار ہے کہ خوش ہونے کے بجائے علم غیب نبی کو طعنہ دے رہا ہے۔

حضرات! برتن میں جو ہوتا ہے اس سے وہی باہر نکلتا ہے چونکہ اس ظالم کے دل میں گندگی بھری ہوئی تھی لہٰذا نوکِ زبان پر بھی وہی گندگی آگئی۔ بس ویسے ہی وحی الٰہی نے اس پر پہرہ بٹھا دیا کہ اسے اسلامی برادری سے نکال دیا جائے۔ اگر اس کی تاویل سن کر کہیں اسے معاف کر دیا گیا تو یہ جرم بہت عام ہو جائے گا۔ اور اندیشہ تھا کہ کہیں وقار نبوت اور ناموس رسالت ان گستاخوں کے ہاتھ بازیچۂ اطفال بن کر نہ رہ جائے۔

مناسب ہوگا کہ یہیں پر امام قاضی عیاض کی ایک "روح پرور، ایمان افروز بات آپ کو سنا دی جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر اطہر پر رحمتوں کے پھول برسائے۔ آمین۔

فرماتے ہیں: اگر کسی گستاخ و دریدہ دہن نے رسول اللہ کے پہنے ہوئے جوتے کو یعنی "نعل" کے بجائے "نعیل" کہہ دیا یعنی صیغۂ

تصغیر کے ساتھ بجائے "جوتا" کے "جتریا" کہدیا جس سے چھوٹے پن کا اظہار ہے تو فرماتے ہیں "وہ مسلمان نہ رہا بلکہ کافر ہو گیا۔ چونکہ اس نے اس جوتے کی توہین و تنقیص کی جس نے تلوا چوما ہے سید عالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔

اور اتنے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ فرماتے ہیں: لَا تُقْبَلُ تَوْبَتُہٗ۔ اس کی توبہ تک نہیں قبول کی جائے گی۔

(اللہ اکبر! یہ ہے ایمان کی وہ حرارت و گرمی، جاں نثاری و فداکاری اور قوت فیصلہ کی وہ شرعی تلوار جس کے ایک ہی وار نے ظالم کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔

حضرات! اللہ کے رسول نے اگر کسی جوتے کو پہن لیا ہے اور اس پہنے ہوئے جوتے کی اگر کوئی توہین کر دے تو وہ مسلمان نہیں رہا پھر جو براہ راست سرکار کی ذات ہی پر حملہ کر رہا ہو تو تم خود بتاؤ کس اسفل السافلین کا ایندھن بنے گا۔ قربان ہی نہیں صد ہزار بار قربان، امام قاضی کے اس فیصلے پر کہ اب اس کی توبہ نہیں قبول کی جائے گی۔ بالکل یہ وہی انداز ہے جس طرح جلال باری نے اس گستاخ کی معذرت کا دروازہ بند کر دیا۔ یعنی گستاخی کر کے معذرت کیسی۔ اگر معذرت قبول کر لی گئی تو صراحۃً کفر لو لو گے اور تاویلاً اسے صحیح و درست ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاؤ گے۔ مناظرہ کرو گے، آنکھیں لال پیلی کرو گے۔ لہٰذا اس کا موقع ہی کیوں دیا جائے۔ آج ہی کیوں نہ اس آنکھ کے ڈھیلے کو نکال کر زمین پر رکھ دیا جائے تاکہ دوسروں کے لیے

مقام عبرت ہے۔ بس اسی طرح قاضی عیاض نے بھی ایسے شاتم رسول گستاخ اور بے ادب کی توبہ قبول نہ کئے جانے کا حکم دے کر ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ تاکہ ایسا نہ ہونے پائے کہ

رات کو مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

پروردگارا! جب تک آسمانوں پر چاند و سورج تیرتے رہیں، جگنو اور ستاروں کی چمک باقی رہے، کلیوں کی مسکراہٹ اور پھولوں کا بانکپن زندہ رہے، کوئل کی کو اور پپیہا کی پی کی صدائیں کانوں میں گونجتی رہیں، موسم کی تبدیلیاں اور رات و دن کی آنکھ مچولی ہوتی رہے۔ قدسی صفات فرشتے تیرے محبوب کی بارگاہ میں درود و سلام کی ڈالی نچھاور کرتے رہیں۔ اس وقت تک امام قاضی عیاض کی قبر اطہر پر تیری رحمتوں و برکتوں کی موسلا دھار بارش ہوتی رہے آمین ثم آمین۔

اگر ان کا قدم نازل جاتا تو میں اسے اپنے ہونٹوں سے چومتا سینے پر رکھتا۔ اور پلکوں سے رکھتا۔ عشق رسول کے عنوان پر ایک کتب خانہ ایک طرف اور یہ سمندر بھری عبارت ایک طرف۔

حضرات! ایک اور ابھرتے ہوئے سوال کا جواب ملاحظہ فرمائیں:۔

آج چور دروازے سے یہ ذہن دینے کی کوشش کی جاری ہے کہ "ارے بھئی! کافر کو بھی کافر مت کہو۔

حضرات! یہ بہت ہی زہریلا نعرہ ہے۔ مٹھاس اور شہد کے پردے میں کیسا زہر ملا ہلاہل ملا ہوا ہے۔ سمیت کی کیسی آمیزش ہے اسے عام آنکھ نہیں پرکھ سکتی۔ بظاہر یہ نعرہ بہت ہی دلفریب و

دلکش بھی ہے۔ اس کے پیچھے کوئی سطحی اور سادہ ذہن نہیں بلکہ اس کے پس پردہ بہت ہی ہوشیار ذہن جھانک رہا ہے۔ اس نے سمجھا تھا چلن کے اوٹ سے آنکھوں کی تلوار اپنا کام کر جائے تو بہتر ہے لیکن ایمان کی شمشیر براں نے ایک لمحہ کی مہلت دیئے بغیر وہیں کا وہیں سر قلم کر کے زمین پر رکھ دیا۔

خالدان یا تو خود ہی پہلے کافر ہوتا ہے اور دوسروں کو حکم دیتا ہے کہ کافر کو بھی کافر مت لکھو۔ یعنی تو نے خود پہلے کافر کہہ دیا یعنی "کافر ہے، لکھو مت"۔ جس طرح کوئی کہے کانے کو بھی کانا مت لکھو یعنی ہے کانا مگر لکھو مت۔ اگر ایسا ہی ہے کہ کافر کو بھی کافر نہ کہنا چاہیئے تو پہلے تو کیوں اسے کافر کہہ رہا ہے۔ ایسے ہی موقع پر کہا جاتا ہے:۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
خود آپ اپنے دام میں صیاد آگیا،

اسی لئے کبھی کبھار میں ایک تقریر کرتا ہوں کہ یہ بولتا ہے مگر سمجھتا نہیں

سوال اور اس کا جواب

سوال اور اس کا جواب:۔ مناسب ہے کہ یہیں پر ایک اور ابھرے ہوئے سوال کا جواب دیدیا جائے۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر ہمارے اکابر سے کہیں خطا ہو گئی اور کلمۂ کفر صادر ہو گیا ہے تو صرف "حفظ الایمان، براہین قاطعہ اور تحذیر الناس" کی کفری عبارات ہی نہ دیکھی جائیں بلکہ ان کی اسلامی خدمات کا بھی جائزہ لیجئے۔ آخر ش انھوں نے کتابیں لکھی ہیں قرآن کے ترجمے کئے ہیں! ایسی کتابیں جس میں مسئلہ کم اور مسالہ زیادہ ہے صابون سازی کا کارخانہ اور طرح طرح کی فیکٹریوں کے کھولنے کے

کامیاب فارغ ہوئے درنج ہیں بڑے بڑے مدرسے ہولسے جس میں عام انسان ہی نہیں "نبی" کو بھی اُردو پڑھائی گئی۔ ان لوگوں نے پیری مریدی بھی کی ہے جس مسئلۂ طریقت اپنے پیر سے پوچھتے تھے اور شرعی مسئلہ خود اپنے پیر کو بتاتے تھے۔ اتنی لمبی چوڑی خدمات کے ہوتے ہوئے بھی آپ لوگ ان کی تکفیر کرتے ہیں حالانکہ ہمارا نعرہ تو یہ ہے کہ "کافر کو بھی کافر نہ کہا جائے"۔

جواب: حضرات! اس کا جواب میں خود نہ دوں گا بلکہ سوال میرا اور جواب آپ کا۔ لیکن ایسا جواب نہ ہو "السلام علیکم" جواب بگین توڑ رہا ہوں۔ آپ جیسے ہوشمندوں سے ہیں اس کی توقع ہے ذہن کو تازہ کرنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہوں۔

حضرات! بچاونتے سال کا بوڑھا شوہر، نوتے سال کی بوڑھی بیوی۔ یہ وہ شوہر ہے جس نے زندگی بھر کمایا مگر بینک بیلنس بیوی کے نام، ہیرے جواہرات اسی کی تجوری میں، باغ و باغیچہ، آراضی و تالاب غرض کہ ہر طرح کی جائداد پر بیوی ہی کا قبضہ۔ سونے اور جواہرات سے لدی ہوئی بیوی اور یہ ہاتھ خالی شوہر۔ دونوں بڑھاپے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ عہد رفتہ اور پرانی باتیں کر رہے ہیں۔ نانی بیتی کا تذکرہ تھا۔ بس اسی اثنا میں گفتگو کا رخ بدل گیا اور بات کا بتنگڑ ہو گیا۔ شوہر نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ غصہ نہ برداشت کر سکا ایک ہی سانس میں دس پانچ طلاقیں پے درپے دیدیں۔ طلاق دینے کے بعد غصہ نارمل ہوا، فکر دامن گیر اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں تو ڈنڈا لے کر دارالعلوم غریب نواز مفتی شفیق احمد صاحب کے پاس حاضر ہوا اس کے آنے سے پہلے اس کی بدخواہ مسئلہ دریافت کرنے پہنچ چکے تھے۔ بوڑھے شوہر نے کہا حضور مفتی صاحب! مسئلہ سنئے

سے پہلے میری ایک بات سن لیجئے، تب حکم صادر فرمائیے۔ بوڑھے شوہر نے کہا حضور! زندگی بھر محنت و مشقت کی، بدن کا پسینہ خون بن کر بہایا۔ خدا نے بہت نوازا۔ ساری دولت اسی بوڑھی پر لٹاتا رہا آج جو کچھ ہے اسی کے پاس ہے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا دو لفظ طلاق ہی کا نہ دیکھئے، میری محبت کا پھیلاؤ بھی تو دیکھئے۔ زر، زمین، باغیچہ بنک بیلنس، سونا چاندی، ہیرے جواہرات، نوع بنوع زیورات غرض کہ مختلف انداز سے میں نے اس پر محبت کے پھول برسائے ہیں اس کے مقابل تو یہ غصہ چند لمحے کا تھا۔ لہٰذا ہمارا ماضی بھی دیکھئے۔ صرف حال نہ دیکھئے۔ جواب دیجئے مگر ماضی کے آئینے میں۔

حضرات! دار العلوم کا فتویٰ تو بعد میں پہلے مفتی صاحبان فرمائیں کہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب! طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔ معلوم ہوا آپ سبھی حضرات سند یافتہ مفتی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ماشاء اللہ۔

بہر حال ایک شوہر نے زندگی بھر خواہ محبت کے کتنے ہی پھول برسائے ہوں مگر جیسے ہی وہ طلاق۔ طلاق کہے گا ویسے ہی میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اب نہ شوہر رہا نہ وہ بیوی۔ اب زندگی بھر کے تعلقات یکسر ختم ہو گئے۔

ٹھیک اسی طرح کسی نے زندگی بھر اسلام کی جو بھی خدمات انجام دیئے ہوں وہ اسی وقت تک قابل قبول اور لائق توجہ ہوں گی جب تک وہ بارگاہِ مصطفےٰ کا نیاز مند و عقیدت کیش رہا۔ مگر جیسے ہی وہ توہین آمیز کلمات کفر استعمال کرے گا ویسے ہی وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اس کو آپ یوں سمجھئے کہ مولانا اپنے صاحبزادہ کی بارات لے کر گئے بر جس قدر بھی

حدودِ شریعت میں رہ کر اہتمام اور دھوم دھڑا کا ہو سکتا تھا وہ سب کچھ کیا، کھانے کا ایسا اہتمام کہ شاہی باورچیوں کو تلاش کر کے بلایا گیا قورمہ، سیخ کباب، شامی کباب، کوفتہ، نرگس کوفتہ، خشکہ، پلاؤ، بریانی مٹر پلاؤ، مرغ پلاؤ، شیرمال غرض کہ نوع بنوع نعمتوں سے دستر خوان کو چن دیا گیا۔ صاحب خانہ نے پہلے غریب نواز کا فاتحہ دلایا پھر مہمانوں نے خوب چٹخارہ لے کر کھایا۔ اب نکاح کا وقت آیا۔ قاضی عبدالسمیع صاحب کانپوری بلائے گئے۔ لڑکی سے کہا فلاں کا بیٹا فلاں نام بعوض مہر فاطمی ہم نے تم کو فلاں کے نکاح میں دیا تم نے قبول کیا۔ اس نے کہا "نا" پھر قاضی صاحب نے سمجھانے کی پوری کوشش کی، اپنی ساری منطق خرچ کر دی مگر اس نے کہا "نا" گھر، محلہ، پڑوس اپنے غیر سبھی اکٹھا ہو گئے پھر اس نے کہا "نا"

اے محترم حضرات! اب اگر مولانا بضد ہوں کہ ہم تو بہر حال بھولے کر جائیں گے۔ بارات لانے میں بے شمار روپئے خرچ ہو گئے۔ اب وہ قبول کرے یا نہ کرے ہم تو بہر حال لے جائیں گے۔

حضرات! اب آپ فرمائیں کہ مولانا اپنی بھولے جا سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔

واہ واہ سبھی مفتی حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا نکاح کھانے پینے، پلاؤ زردہ، قورمہ قلیہ کا نام نہیں ہے، صرف ایجاب و قبول کا نام ہے۔ اگر مولانا بھولی بارات لے کر آئے ہوتے اور ایجاب و قبول ہو جاتا تو خوشی خوشی بہو لے کر چلے جاتے جس طرح نکاح میں دھوم دھڑا کے کا پھیلاؤ نہیں دیکھا جاتا بس ایجاب و قبول۔ ایسے ہی علیحدگی کے لئے محض لفظ طلاق ٹھیک اسی طرح مومن ہونے یا نہ ہونے میں نماز و روزہ کا پھیلاؤ

نہیں دیکھا جاتا۔ بس اتنا کافی ہے مصطفےٰ کا ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو یہ ساری چیزیں کام کی ہیں اور اگر سرکار کا نہیں تو ہر چیز بیکار۔ نا قابلِ قبول۔ عنوان یہی تھا کہ صحیح عقائد مدارِ نجات ہیں اعمال نہیں۔

حضرات! ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو دیگر مثالوں سے اور سمجھا دیا جائے۔ یہ پیچیدہ مسئلہ تو نہیں تھا مگر نادانوں نے پیچیدہ بنا دیا ہے۔

ارے صاحب! یہ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، داڑھیاں رکھتے ہیں، مگر پھر بھی کافر کہا جائے۔؟

اے عصرِ حاضر کے فراعنہ: تم نے ان کی داڑھیاں دیکھیں، نمائشی سجدے دیکھے، سرکاری حج دیکھے مگر ان کے دل کا چور نہ دیکھا آؤ دربارِ فاروقی میں۔ یہ وہ واقعہ ہے جسے آپ نے بارہا علماء سے سنا ہوگا۔ جب بات آہی گئی ہے تو اختصاراً مجھ سے بھی سن لیجئے۔

ایک نام نہاد مسلمان و منافق، اور ایک یہودی کے درمیان یہ نزاع تھا کہ آج پہلے کسے پانی لینا چاہیئے۔ یہودی کہتا تھا میری باری ہے اور وہ منافق کہتا تھا ہماری باری ہے۔ جب بات زیادہ بڑھی تو منافق نے کہا آپس میں لڑیں نہیں۔ زمانہ نبی کا ہے چل کر انھیں سے فیصلہ لے لیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ لہٰذا پیغمبر میرے ہی حق میں فیصلہ فرمائیں گے۔ چنانچہ یہودی نے کہا اگرچہ وہ پیغمبر نہیں مگر اس کا یقین رکھتا ہوں کہ اگر وہ نبی ہوں گے تو غلط فیصلہ نہیں کریں گے کیونکہ نبی کا فیصلہ غلط نہیں ہوتا۔ چلو چلیں۔

چنانچہ دونوں پہنچے۔ مقدمہ سماعت فرمانے کے بعد اللہ کے رسول نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیدیا کہ آج اس کی باری ہے۔ وہ بد باطن اپنے منصوبے کے لحاظ سے بڑا شرمسار ہوا۔ اور یہودی

سے کہنے لگا یہ اللہ کے رسول ہیں پتہ نہیں کس عالم محویت و استغراق میں تھے۔ چلو فاروق اعظم کے پاس۔ وہ بہت ہی مدبر و مفکر ہیں۔ ان کا فیصلہ حاصل کریں۔

یہودی نے کہا کہ ہم اس کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ نبی کے صحابی بھی غلط فیصلہ نہیں دیں گے۔ لہٰذا ہم وہاں بھی چلنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ دونوں پہنچے۔ فاروق اعظم نے فرمایا تم دونوں کیسے آئے۔ یہ نمازی بولا ایک مقدمہ میں آپ کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ فاروق اعظم کا تیور بدل گیا زمانہ رسول اللہ کا ہے اور فیصلہ لینے میرے پاس آیا ہے۔

ذکر حضرت اکبر جذبۂ ایمانی اسے کہتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر نفس موٹا ہوتا تو خیال فرماتے اب میں بھی اس قابل ہو گیا کہ لوگ مجھ سے فیصلہ لینے آنے لگے۔ مگر فیضان نبوت سے نفس پائمال ہو چکا تھا تو نمازی بولا ان کا فیصلہ تو لے چکے۔ بس یہ سننا تھا کہ بہت کچھ سمجھ گئے اچھا رکو ابھی فیصلہ کئے دیتا ہوں۔ اندر گئے تلوار میان سے باہر نکالی اور ایک وار میں اس نمازی کا سر قلم کر دیا۔ سر ادھر گرا۔ دھڑ ادھر گرا دیانت کا گلا مت گھونٹو، انصاف کا خون مت کرو، سچ سچ بتاؤ۔ آخر اس نمازی نے کیا کیا تھا۔ یہی تو کہا تھا کہ نبی کا فیصلہ لے چکے لیکن فاروق اعظم نے سر کو تن سے جدا کر دیا۔ ڈانٹا پھٹکارا نہیں۔ دو چار طمانچے نہیں مارے۔ دس پانچ دُرّے نہیں لگائے۔ بلکہ ایمان کی بھرپور توانائیوں سے آگے بڑھ کر خاک و خون میں اسے لت پت کر دیا۔ سر کہیں دھڑ کہیں۔ آخر مجھے بتائیے کہ یہ سچا پکا نمازی فاروق اعظم کی نظر میں قابل گردن زدنی کیوں ہو گیا۔؟

محترم حضرات! بات اتنی سی ہے جب اس کلمہ گو نمازی نے یہ کہا کہ میں نے پیغمبر اسلام کا فیصلہ لے لیا تو فاروق اعظم تاڑ گئے کہ ہو نہ ہو

یہ رسول اللہ کے فیصلے سے راضی نہیں ہے۔ اگر راضی ہوتا تو میرے پاس کیوں آتا؟ آپ نے دیکھا جبلّتِ فاروقی کو کہ اس حال میں اسے زندہ چھوڑ دیا گیا تو اس کے جیسے نہ جانے کتنے موسمی مینڈک اور برساتی کیڑے پیدا ہو جائیں گے جو حشرات الارض کی طرح زمین پر پھیل کر نماز و روزے کی نمائش میں اپنی عیاری و مکاری کا جال پھیلائیں گے اور مدرسہ و کتابوں کے نام پر دکانیں سجائیں گے۔

لہٰذا اگر بہ "کشتن روزِ اول" پر عمل کرتے ہوئے فاروق اعظم نے سر ہی قلم کر دیا۔ تاکہ اسلامی معاشرے میں ایسے نجس و ناپاک شخص کا وجود ہی نہ رہ جائے۔

اور آگے بڑھیے شدہ شدہ یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک گئی۔ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ چنانچہ آقائے کائنات نے فاروق اعظم سے فرمایا، عمر تم نے یہ کیا کیا؟ کہیں لوگوں میں یہ افواہ نہ پھیل جائے کہ مسلمان ہی مسلمان کا قتل ہو رہا ہے۔ عمر کی نظریں قدم بوس ہوئیں۔ عرض کیا یا رسول اللہ! اگر میں اسے مسلمان ہی سمجھتا تو اس کا قاتل کیوں ہوتا۔ اس کی گرد راہ کو آنکھوں سے لگا لیتا۔ فاروق اعظم کا یہ عرض کرنا یا رسول اللہ جو اللہ اور رسول اللہ کے فیصلہ پر راضی نہ ہو وہ مسلمان ہی کہاں رہا۔

چنانچہ ٹھیک اسی وقت ان ہی الفاظ میں وحیٔ الٰہی اتر گئی۔

جبریل امین حاضر دربار ہوئے۔ عرض کیا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

تو اے محبوب! تمہارے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے جب

تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم نہ بنائیں۔ پھر جو کچھ تم حکم فرماؤ اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں۔

آج کا دارالافتار تو ان شاتمان رسول پر محض حکم شرعی لگاتا ہے اگر عہد فاروقی ہوتا تو پہلے دُرّوں سے ان کی برہنہ پشت پر ضرب کاری لگائی جاتی پھر انھیں کیفر کردار تک پہنچا دیا جاتا۔

یہ تو رحمت تمام ہیں کہ ان دریدہ دہنوں کی زبانیں سلامت ہیں اگر کہیں جلال موسوی ہوتا تو زبانیں کٹ کر گر گئی ہوتیں۔ اور عہد فاروقی ہوتا تو راکھ لگا کر ان کی زبانیں گدی سے کھینچ لی گئی ہوتیں۔ بھائیو! انصاف کا خون مت کرو۔

اسی لئے میں کبھی کبھی تقریر میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ایمان کا رشتہ خون پر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کا ایک واقعہ سماعت فرمائیں:۔

ایک دن عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما اپنے والد محترم سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ تو والد کا موڈ اچھا دیکھ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنے دورِ جاہلیت کی ایک بات گوش گذار کروں۔ والد نے اجازت دی ہاں کہو۔ بیٹے نے کہا: والد محترم وہ جنگ آپ کو یاد ہوگی جب کہ آپ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اور میں کفر کی گندگیوں میں پڑا ہوا تھا۔ ایک جنگ میں آپ لشکر اسلام کے ساتھ تھے اور میں کافروں کے دستے میں تھا۔ گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی کہ اچانک میری نظر ایک آنے والے پر پڑی جو شکل و شباہت میں مسلمان تھا۔ چنانچہ اپنی تلوار کو سونت کر تیار ہو گیا کہ زد میں آتے ہی گردن کاٹ کر الگ کر دوں گا۔ مگر جب آنے والا قریب آیا تو میں نے یہ دیکھا کہ کوئی

اور نہیں وہ آپ تھے۔ خون کا رشتہ غالب آیا۔ باپ سمجھ کر میں نے چھوڑ دیا۔ یہ سنتے ہی صدیق اکبر نے فرمایا بیٹے! تم نے تو مجھے باپ سمجھ کر چھوڑ دیا لیکن اگر میری نظر تم پر پڑ گئی ہوتی تو میں یہ نہ دیکھتا کہ تو میرا بیٹا ہے دشمنِ رسول سمجھ کر ذبح کر دیتا قتل کر دیتا۔ وہ کفر کا مزاج ہے جو خون کا رشتہ دیکھتا ہے۔ اسلام کا مزاج یہ کہ نہ پہلے خون کا رشتہ نہیں دیکھتا بلکہ ایمان کا رشتہ دیکھتا ہے۔

حضرات! گفتگو ختم کرتے ہوئے آخری بات آپ سے عرض کر کے رخصت ہونا چاہتا ہوں کہ صحیح عقائد مدارِ نجات ہیں اعمال نہیں۔

سن لیجیے! گفتگو ختم کرتے ہوئے آخری بات آپ سے عرض کر کے رخصت ہونا چاہتا ہوں اگر کسی کی عمر ننانوے برس گیارہ مہینہ انتیس ۲۹ دن کی ہے۔ ستر برس میں ایک دن باقی ہے۔ اس نے ساری عمر گناہ کیا، کفر بولا ہے، شرک کیا ہے، چوری کی ہے، ڈاکہ ڈالا ہے شراب نوشی کی ہے، غرض کہ اس کی پوری عمر سرکشی، معصیت کیشی، میں گذری، مگر سو برس پورے ہونے میں جو ایک دن باقی رہ گیا ہے اسی روز اس نے رسول اللہ کا کلمہ پڑھ لیا۔ ان کے دامن کرم کو تھام لیا، مشرف باسلام ہو گیا۔ تو آپ جانتے ہیں اب یہ ایسے ہی ہے جیسے ابھی ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ سارا گناہ اور پاپ دھل گیا۔ اس کے بعد نہ وہ ایک وقت کی نماز پڑھ سکا نہ حج کر سکا، نہ زکوٰۃ دے سکا، نہ روزہ رکھ سکا۔ ایمان لایا اور اس کا انتقال ہو گیا۔

خوب جی لگا کے سنو! یہ مومن ہو کے مرا۔ اور جنتی ہو کے مرا۔ یہ مومن ہے اور جنتی ہے۔ حالانکہ اس کے پاس عملِ صالح نہیں۔

عمل کی ایک کانی کوڑی تک نہیں، نہ سجدہ ہے نہ روزہ ہے نہ حج ہے نہ زکوٰۃ۔ جب فرائض نہیں تو نوافل اور سنن و مستحبات کا کیا سوال؟ مگر وہ نجات یافتہ ہے جنتی ہے اور میری تقریر کا عنوان ہے کہ:

"صحیح عقائد مدارِ نجات ہیں اعمال نہیں"

اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں: ایک شخص کی عمر ننانوے برس گیارہ مہینہ انتیس دن کی ہے ساری زندگی اللہ اللہ کرتا ہے، یادِ الٰہی سے کبھی غافل نہ ہوا۔ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ اشراق، چاشت، اوّابین، تہجد غرض کہ عبادت و ریاضت کا سارا سرمایہ اس کے پاس ہے لیکن وہی سو برس میں جو ایک دن باقی رہ گیا تھا اس رات اس نے ہوش و حواس کی درستگی میں رسول اللہ کی توہین، گستاخی اور بے ادبی کر دی اور اس کے بعد وہ مرگیا۔

اب سن لیجئے مسلمان نہیں کافر ہو کے مرا۔ جنتی نہیں جہنمی اور دوزخی ہے۔ گویا میرے سرکار ہی معیار ہیں، بے شمار گناہوں کے بعد ان کا کلمہ پڑھ لیا، ان کا ہو گیا تو سب گناہ دھل گیا۔ بلا روک ٹوک سیدھے جنت چلا گیا۔

عبادات کی لمبی فہرست، اعمال کا بڑا بوجھ لیکن ان کا دامن جب چھوٹ گیا تو زندگی کا سب کیا دھرا مٹی میں مل گیا۔ اب اس میں سے کچھ کام نہیں آئے گا۔ ؎

چھٹ جائے اگر دولت کونین تو کیا غم
چھوٹے نہ مگر ہاتھ سے دامان محمد

صلی اللہ علیہ وسلم

فالحمد للہ علی ذالک۔

اسلام میں یادوں کی اہمیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی حبیبہ
الذی اصطفی۔ قال اللہ تبارک وتعالے
فی القرآن المجید والفرقان الحمید ۵

وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ؕ

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے کہ یادوں کو برقرار رکھا جائے۔ مٹایا نہ جائے۔ ہم اہلسنت وجماعت سال کے مختلف مہینوں کے مخصوص اوقات میں اپنے اسلاف واکابر کی یادیں مناتے ہیں۔

محترم حضرات! میں ڈھکی چھپی باتوں کے کہنے کا قائل وعادی نہیں ایسے اشارات وکنایات جو ذہنوں کو بوجھل تو بنا دیں مگر عقدہ کشائی نہ کرسکیں ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ یہ کوئی لال بجھکڑ کی محفل نہیں ہے جس میں پہیلیاں بجھائی جائیں۔

سیکڑوں نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

یہاں آپ مسائل سمجھنے آئے ہیں۔ اور میں نے حتی المقدور انہیں

سمجھانے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے ۔

لہٰذا میں بہت ہی واضح الفاظ میں اس کا اظہار کئے دیتا ہوں کہ ہم اہلسنت وجماعت کبھی محفل میلاد شریف منعقد کرتے ہیں۔ بارہ ربیع الاول شریف کو جلوس عید میلاد النبی نکالتے ہیں۔ گیارہ ربیع الثانی شریف کو پیران پیر دستگیر حضور سیدی سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالے عنہ کی فاتحہ دلاکران کی یاد مناتے ہیں چھٹی رجب شریف کو سلطان ہند خواجۂ خواجگاں سیدی سرکار غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یاد مناتے ہیں ۔ دسویں محرم الحرام شریف کو نواسۂ رسول سیدنا امام عالی مقام سرکار حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور چودھویں شعبان کو اللہ کے رسول کے ایک نادیدہ عاشق حضرت سیدنا اویس قرنی اور پچیس صفر کو امام اہلسنت مجدد دین وملت سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالے عنہم اجمعین کی یادیں مناتے ہیں ۔ اور دسویں ذوالحجہ کو حضرت سیدنا ابراہیم خلیل ، اور حضرت سیدنا اسماعیل ذبیح کی یادیں مناتے ہیں ۔ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ علیہما ۔

غرضیکہ سال و مہینے اچھے خاصے یادوں میں گھرے ہوئے ہیں ۔ لہٰذا آج ہم کو اور آپ کو مل جل کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم لوگ وفور عقیدت اور افراط محبت میں من مانی یادیں مناتے ہیں ۔ یہ اختراع محض ہے یا کوئی مفروضہ و من گھڑت تصور ہے ؟ یا واقعتاً اسلام اپنے ماننے والوں کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ یادیں منائی نہ جائیں بلکہ یادیں منائی جائیں ۔ اور انھیں برقرار رکھا جائے ؎

حضرات : میں یقین و اعتماد کی بلند ترین چوٹی سے ببانگ دہل اس کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اسلام کا سچائی اور دیانتداری کے ساتھ عمیق و گہری نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو گی کہ اسلام کھلے بندوں اس کی اجازت دیتا ہے کہ یادیں منائی نہ جائیں بلکہ منائی جائیں ؎

اگر کسی آنکھ پر تعصب و تنگ نظری اور عصبیت و تنگ خیالی کی عینک لگی ہو تو اب وہ اسے اتار دے اور انتہائی اعتدال پسندی اور سنجیدہ مزاجی سے آنے والی گفتگو پر دھیان دے۔

حضرات! اس سلسلہ میں سب سے پہلے آپ کو عہد رسالت کی ایک بات یاد دلاتا چلوں۔

زمانہ آقائے کائنات کا ہے جسے خیر القرون (بہترین زمانہ) کہا جاتا ہے۔ مہینہ غیر رمضان کا ہے اور دن دوشنبہ کا۔ سید عالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزہ سے تھے۔

اس سلسلہ میں مسلمانوں کا ایک اسلامی مزاج اور اس کی اسلامی فطرت یہ ہے کہ اگر کوئی توانا، تندرست۔ ہٹا کٹا۔ کڑیل جوان، رمضان کے مہینے میں روزہ سے نہ ہو تو اس سے دریافت کیا جائیگا کہ تمہارا روزہ کیوں نہیں؟

اور ایسے ہی اگر کوئی درویش صفت غیر رمضان میں تشریف لائیں۔ آپ نے اس محترم و معزز مہمان کے کھانے کا نظم کیا، ساری نعمتیں دسترخوان پر چن دیں۔ اب آپ نے عرض کیا تشریف لائیں اور کھانا تناول فرمائیں۔ مہمان نے جواب دیا میں کھانا نہ کھاؤں گا۔ آپ نے حیرت زدہ ہو کر دریافت فرمایا کیا کوئی فروگذاشت یا کوتاہی ہو گئی ہے؟

آنے والے مہمان نے جواب دیا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ میں روزہ سے ہوں۔

یقیناً ایسے موقع پر آپ سوال کریں گے۔ یہ آج آپ کا روزہ کیسا ہے؟

معلوم ہوا مسلمانوں کا یہ اسلامی مزاج ہے کہ رمضان میں روزہ نہ رکھنا قابل تعجب اور غیر رمضان میں روزہ رکھنا باعث حیرت۔

چنانچہ جب صحابۂ کرام کو معلوم ہوا کہ آقائے دوجہاں روحی فداہ صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم روزہ سے ہیں تو صحابۂ کرام نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! یہ آج سرکار کا روزہ کیسا ہے؟

جواباً سرکار نے ارشاد فرمایا "یوم ولدت" "آج کے دن میں پیدا کیا گیا ہوں یعنی آج میرا یوم ولادت اور پیدائش کا دن ہے۔ اس سے پتہ چلا اور حقیقت منکشف ہوگئی کہ سرکار ابد قرار نے "یوم" کی قید لگا کر متنبہ فرما دیا کہ میں نے اپنے "یوم ولادت" کو مرنے نہیں دیا بلکہ روزہ رکھ کر اسے زندہ رکھا ہے۔

معلوم ہوا کہ بڑے۔ اچھے اور تاریخی دنوں کو فراموش نہیں کیا جاتا بلکہ اسے کسی نہ کسی طرح زندہ رکھا جاتا ہے۔

ایک سوال ہاں اب کوئی دشمن رسول یہ سوال کر سکتا ہے کہ میں نے اس حد تک تسلیم کر لیا کہ تاریخی دنوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ اسے برقرار رکھا جاتا ہے۔ تو پھر ایسا کیجئے کہ جس طرح رسول خدا نے روزہ رکھا۔ بارہ ربیع الاول شریف کو آپ لوگ بھی روزہ رکھا کیجئے۔ یہ گیٹ اور شامیانہ کیسا؟ رنگ برنگ کی جھنڈیاں کیسی؟ پلاؤ اور بریانی کیوں؟ آرائش و زیبائش کیسی؟ محفل میلاد اور سلام و قیام کی دھوم دھام کے کیا معنیٰ؟ جشن چراغاں اور تقسیم تبرک کا اہتمام کیسا؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہاں اگر یاد ہی منانا ہے تو خاموشی سے آپ لوگ بھی روزہ رکھ لیا کیجئے۔

بہت خوب! معلوم ہوا پڑھے نہیں گئے تھے بلکہ "بھاڑ" جھونکے گئے تھے۔ جی جناب والا! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس طرح کے بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں۔ اس سے اسی فعل کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی کہ بس یہی کیا جائے بلکہ اسی سے اصول وضابطے، آئین ودستور جنم لیتے ہیں۔ بلکہ وہی فعل مقیس علیہ بنتا ہے۔ اور دوسری چیزوں کو اسی پر قیاس کیا جاتا ہے۔

مثلاً آقائے دوجہاں صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے نعت گو شاعر خصوصی حضرت حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں جن کا معمول یہ تھا کہ خواہ وہ خود کہیں بھی رہتے مگر آنکھ ان کی ہوتی اور روئے زیبا مصطفےٰ کا، زبان ان کی ہوتی اور خطبہ رسول اللہ کا۔ غرضیکہ سرکار کی ایک ایک ادا کو شعر وسخن کے سانچے میں ڈھالنا اور اسی بہانے آتش محبت پر شبنم کا چھڑکاؤ کرنا ان کا دستور محبت تھا۔ دلِ ویراں کو محبوب کی یادوں سے آباد رکھنا، یہ ان کی زندگی کا بہت ہی حسین مشغلہ تھا ؎

انھیں جانا انھیں مانا نہ رکھا غیر سے کام
لِلّٰہِ الحمد میں دنیا سے مسلمان گیا،

شاعر کی فطرت ہے، جب وہ نظم، غزل، نعت وقصیدہ وغیرہ کے دو چار شعر بھی کہہ لیتا ہے تو کسی ایسے باذوق وسلیم الطبع کو ڈھونڈتا ہے جس کو اپنا کلام سنا کر اس کی داد حاصل کر سکے۔ کبھی کبھی تو یہ ذوق شاعر کو وارفتگی کی اس حد پر پہنچا دیتا ہے کہ جب وہ کسی کو نہیں پاتا تو دیوار ودر ہی کو سنانے لگتا ہے۔

حضرات! روزانہ تو حضرت حسان دوسروں کو تلاش کرتے تھے لیکن آج
ان کا نصیبہ ہمدوش ثریا ہو کر منتہائے کمال کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔

آج کوئی اور نہیں، خود آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
"حسان" میرے متعلق جو تم نے کہا ہے۔؟ کچھ مجھے بھی تو سناؤ۔
اسے کوئی نہیں جانتا۔ کہ یہ سنتے ہی "حضرت حسان" پر کیا کیفیت گذرگئی
حضرات! مجھے کہہ لینے دیجئے، گویا آج عاشق کی نہیں خود عشق کی معراج ہے
حسین نہیں، خود حسن، سننا چاہتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک نکتہ ملاحظہ فرمائیں۔

ایک نکتہ حضرت حسان، کو یہ حکم دے کر اپنا نعتیہ کلام مجھے سناؤ۔ گویا سرکار کسے نعت لکھنے، نعت سنانے اور نعت سننے کا جواز پیدا
کرنا چاہتے ہیں یعنی نعت شریف لکھی بھی جا سکتی ہے۔ سنائی بھی جا سکتی ہے اور
سنی بھی جا سکتی ہے۔ عصر حاضر کے فراعنہ، بدبخت اور بدنصیب نعت شریف
کا نام سنکر "منہ بسورتے" اور "ناک بھوں چڑھاتے ہیں" اور ان کے
مکروہ چہرے پر ایسی بدنما گہری لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ جس سے چہرے کا زاویہ بدل
جاتا ہے۔ گویا میرے سرکار کا یہ ارشاد ہمایوں ان کے بدزیب چہرے پر عینی
طمانچہ" اور ان کی برہنہ پشت پر" تازیانۂ عبرت ہے۔ یہ ان کا ایسا بدبختانہ کردار
ہے کہ انسانیت ہمیشہ نفریں و ملامت کرتی رہے گی۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سرکار نے فرمایا "حسان" مجھے میری نعت
سناؤ۔ حسان حکم ملتے ہی سراپا ادب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ابھی نوک زبان
پر کوئی حرف نہ آیا تھا، اب کچھ عرض کرنا ہی چاہتے تھے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا! حسان! رک جاؤ۔
یہ سنتے ہی لرزہ براندام ہو گئے۔ خاموشی اور سناٹے کی فضا بندھ گئی۔

اب سرکار نے ایک صحابی کو حکم دیا جاؤ وہ منبر لاؤ۔ حکم پاتے ہی وہ صحابی آگے بڑھے۔ کیوں نہ جاتے؟ وہ صحابی تھے۔ ... نہ تھے۔ اور منبر حاضر لائے۔ اب میرے سرکار نے حضرت حسان کو دوبارہ حکم دیا کہ حسان! اس منبر پر آجاؤ اور میری نعت پڑھو۔

میں دنیا سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ کلام فرش خاک پر نہ پڑھا جا سکتا تھا؟ منبر ہی کیوں منگایا گیا؟

حضرات! اس واقعہ کو پیش کر کے تقریر کو طول دینا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک خاص نکتہ آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ یعنی منبر کو سرکار اہتمام کی دلیل بنا دینا چاہتے ہیں یعنی یہ کسی اور کا نہیں میرا ذکر ہے۔ لہٰذا میرے ذکر میں اہتمام کرنا چاہئے معلوم ہوا بولا تو منبر ہی جا رہا ہے مگر اب اس سے مراد منبر ہی نہیں ہے۔ بلکہ جب میرا ذکر کیا جائے تو اس میں اہتمام کیا جائے گویا منبر کی دلالت، اہتمام پر ہو رہی ہے۔ یعنی ذکر مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء بالکل سادہ طریقے سے نہ کیا جائے۔ بلکہ اس میں اہتمام ہونا چاہئے۔

حضرات! اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ منبر منگا کر، اہتمام کی دلیل دینی مقصود ہے۔

اور "اہتمام" ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ اسمیں تخت، کرسی، منبر، چادر، فرش و فروش، شامیانہ، گیٹ، لائٹ، جھنڈیاں، اگربتی، عطر، تبرک اور لنگر یہ سب کے سب اسی میں شامل ہیں۔ گویا اہتمام کے پیٹ میں یہ سب موجود ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایسی گہرائیوں اور بطون کو دیکھنے و سمجھنے کے لئے نور ایمان اور نگاہ مومن درکار ہے۔ "پیاز" کا ایک ہی چھلکا نہیں ہوتا چھلکے پر چھلکا ہوتا ہے۔ بس ایسے ہی۔ بہت سے مسائل کے بطون ہوتے ہیں جس میں تہ بہ

تہ ہوتی ہے۔ خزینہ میں خزینہ اور گنجینے میں گنجینہ ہوتا ہے۔

اہتمام، بظاہر ایک ہلکا پھلکا سا لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے پھیلاؤ اور وسعتوں میں بے پناہ گہرائیاں ہیں۔ چنانچہ محفل میلاد شریف میں آرائش و زیبائش سے متعلق جس قدر بھی پھیلاؤ دیکھا جاتا ہے۔ وہ سب کے سب اسی لفظ "اہتمام" کی کوکھ سے جنم لئے ہیں۔ انھیں نہ تو کہیں اور جگہ ڈھونڈا گیا نہ اور کہیں سے لایا گیا

لہٰذا سرکار کے روزہ رکھنے کا مقصد، امت کو روزہ ہی رکھوانا نہیں ہے بلکہ سرکار دوشنبہ مبارکہ کو روزہ رکھ کر اس دن کی اہمیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں گویا آج کے روز کوئی بھی ایسا جائز و شرعی کام کیا جائے کہ جسے لوگ دیکھ کر یہ دریافت کرتے ہوں کہ کل ایسا نہیں تھا، آج ایسا کیوں ہے؟

چنانچہ عید میلاد النبی کا جلوس اور جلسۂ عید میلاد النبی کے گیٹ، اسٹیج شامیانے، اور ڈیکوریشن وغیرہ۔ یہ اسی سوال کی علامت اور نشانی ہیں۔

انھیں سبھوں کو دیکھ کر نہ جاننے والے، جاننے والوں سے دریافت کرتے ہیں کہ آج یہ کیسا اہتمام ہو رہا ہے؟ اب ان کو جواب دیا جاتا ہے کہ آج ہی پیغمبر اسلام کی پیدائش کا دن ہے۔

ذرا تم ہی بتاؤ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو دوسری قوموں کو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ مسلمان کسی مردہ قوم کا نام ہے یا کسی زندہ قوم کا۔ اور اس سلسلہ میں ارشاد باری بھی ہے وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اور اپنے رب کی نعمت کا اعلان و چرچا کرو۔ سرکار سے بڑھ کر ہمارے لئے اور کونسی دوسری نعمت ہو سکتی ہے معلوم ہوا رب کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپایا نہیں جاتا۔ بلکہ اس کا اعلان اور چرچا کیا جاتا ہے۔ یہ جلوس عید میلاد النبی اور جلسۂ عید میلاد النبی یہ دونوں اسی تحدیثِ نعمت اور اعلان و اظہار کے حسین مناظر و مظاہر ہیں۔ جو خوش عقیدہ

مسلمانوں کے جوشِ محبت اور وفورِ عقیدت کی ایک تابناک ور درخشاں دلیل ہیں۔ یہ ہمارا ایک جمہوری حق ہے۔ نہ تو اب سے پہلے کسی نے اس پر قدغن لگایا۔ اور نہ ہی کسی نے پہرہ بٹھایا۔ ہم اس رسم سعید کو مناتے چلے آرہے ہیں اور اپنی حیاتِ مستعار کے آخری لمحے تک، اگر خود نہ منا سکیں گے تو کم از کم دل زندہ میں یہ آرزو ضرور مچلتی رہے گی۔ کہ جشنِ چراغاں کی دھوم دھام عشق کی پردردہ آنکھیں دیکھتی رہیں ؎

گو ہاتھ میں طاقت نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

حضرات! بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ سرکار کے روزہ رکھنے کا مقصد ہرگز ہرگز روزہ ہی رکھوانا نہیں ہے بلکہ کسی بھی شرعی و جائز فعل سے اس دن کی حرمت و عزت کو برقرار رکھ کر اس کا اعلان، و چرچا بھی مقصود ہے تاکہ اس دن کی یاد باقی رہ جائے۔

حضرات! جب حضرت حسان کا ذکر آ ہی گیا ہے تو بر سبیل تذکرہ ان کے کمالِ عشق اور بے لوث محبت کی دل جیتنے والی ادا ملاحظہ فرمائیے:۔

حضرت حسان ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

ما ان مدحت محمدا بمقالتی
لکن مدحت مقالتی بمحمد

اے لوگو! تم کہیں یہ دھوکہ نہ کھانا کہ میری شاعری اور شعر و سخن نے رسولِ کردگار کا مقام و منصب اونچا کر دکھایا۔ معاذ اللہ حاشا و کلا۔ ایسا نہیں۔ میری شاعری سے ان کا مقام بلند نہیں ہوا۔ بلکہ میری شاعری میں سرکار کے نام آجانے کی وجہ سے میرا کلام اونچا ہو گیا۔ سبحٰن اللہ سبحٰن اللہ۔

قربان جائیے ! یہ تھا صحابۂ کرام کا زندۂ جاوید عشق ۔ عشق اور راہِ محبت میں ایسی معتدل و محتاط روش جو کہیں اور ڈھونڈے نہ مل سکے ۔

کہاں ہیں ؟ آج کے نام نہاد دعویداران عشق و محبت ، اور کہاں ہیں شرک و بدعت کے کھوکھلے نعروں کے سہارے ، سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان واعتقاد پر دن دہاڑے ڈاکہ ڈالنے والے جو خود اپنے رسول ہی کو زبانِ اردو پڑھانے کے مدعی ہیں ۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

حضرات ! عنوان یہ چل رہا ہے : یادوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ یادوں کو برقرار رکھا جاتا ہے ۔ چنانچہ اس سلسلہ میں تاریخ کی ایک اور سبق آموز کڑی ملاحظہ فرمائیے !

حضرات ! غزوۂ احد تاریخ اسلام کا ایک بہت ہی اہم معرکہ ہے ۔ مجھے اس کی تفصیل نہیں بتانی ہے بلکہ اس کا پس منظر پیش کرنا ہے ۔ فتح و کامرانی کے بعد جب شہدائے احد کی نعشوں کی تدفین عمل میں لائی گئی ۔ اس کے ٹھیک ایک سال پورا ہونے کے بعد آقائے دوجہاں شہدائے احد کی قبروں پر تشریف لاتے ہیں ۔

اوّلاً تو ایک سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ اگر تشریف لانا ہی تھا تو ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ سال پورا ہونے کے دو ایک روز پہلے یا دو ایک روز بعد تشریف لاتے ۔ مگر ایسا نہیں ہے ٹھیک اس روز جس دن سال پورا ہو رہا ہے گویا آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اپنی قوم کو یہ ذہن دینا چاہتے ہیں کہ قبروں پر آنا بھی جائز ہے اور برسی منانا بھی درست ہے ۔

یعنی اس تشریف آوری کا یہ مقصد ہے کہ اگر یہاں نہ آیا جائے تو اعلائے

کلمۃ الحق کی خاطر شہدائے اُحد کے ایثار و خلوص، جاں بازی و جوانمردی، حق گوئی و ایثار پسندی گویا تن، من، دھن لٹا دینے کے جو روشن نقوش ہیں اندیشہ ہے کہ کہیں وہ مٹ نہ جائیں۔ اور تاریخ کے ایسے زریں نقوش جس سے امت مسلمہ کو سبق حاصل ہو اور اندھیرے میں اجالے کا کام دیں۔ انھیں مٹایا نہیں جاتا بلکہ اگلی نسلوں کو زندہ رکھنے کی خاطر انھیں زندہ رکھا جاتا ہے۔ اور آج ہمیں آپ سے یہی عرض کرنا ہے کہ یادوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ انھیں شریعت کے بتائے ہوئے طریقوں پر خوش اسلوبی سے منایا جاتا ہے۔

سید عالم روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شہدائے احد کی قبروں پر تشریف لاکر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ شہدائے اسلام جو اپنی اپنی قبروں میں میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ للہیت و راستبازی اور ایثار و قربانی کی ایک بہت ہی اہم تاریخ وابستہ ہے۔

لہٰذا انھیں کسی نہ کسی بہانے یاد کیا جائے۔ انھیں ہرگز ہرگز نہ بھلایا جائے۔ یاد رہے کہ تاریخ ساز شخصیتوں کا مجاہدانہ کردار محض ایک مؤرخ کے نوکِ قلم ہی تک نہ محدود رہے۔ کہ محض کتاب کی سطروں میں انھیں پڑھا جائے بلکہ ان کے آستانوں تک اور گنج شہیداں میں پہنچ کر خون کی ایک ایک چھینٹ اور لہو کی ایک ایک بوند سے ان کی داستانِ عظمت پوچھئے! جہاں کے دیوار و در اور ذرے ذرے کہہ رہے ہوں گے ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خدانخواستہ! شرک و بدعت کے ہتھکنڈوں کے تحت اگر آستانہ جات پر آمد و رفت بند کر دی گئی تو کم تعلیم یافتہ، عدیم الفرصت اور مصروف بکار حضرات جنھیں تاریخی مطالعہ کی فرصت نہیں، جو آستانہ جات کی قدیم علامات و نشانات ہی سے ان کی تاریخ پڑھنا جانتے ہیں۔ آخر ان لوگوں میں مذہب اسلام

کے لئے اخلاص وایثار کی اسپرٹ کہاں سے پیدا ہو سکے گی؟ ضرورت ہے ان کے مزارات پر آتے رہنے کی۔ گویا ؎

تازہ خواہی داشتن گرداغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

خواہ ان واقعات وقصص کو تاریخی کتابوں میں پڑھئیے یا آستانوں کو پہنچ کر، وہاں کے دیوار و در اور بے زبان خاموش ذروں سے پوچھئے۔

بہرحال اسلام کی اہم شخصیتوں اور اسلام کے اہم واقعات کو بھلایا نہیں جاتا۔ بلکہ ان کی یادیں منا کر انھیں سینے سے لگایا جاتا ہے۔ اور یہی ہمارا مدعا ہے۔

البتہ یہ بات واضح رہے کہ مراسم کی ادائیگی اور یادوں کے منانے میں اسلام نے جو خطوط کھینچے ہوں۔ ان سے متجاوز ہونے کی جسارت اور سعی بے جا نہ کی جائے ورنہ کہیں نہ کہیں افراط یا تفریط کا الزام آ جائے گا۔ اور اسلام کسی بھی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔

حضرات! ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ آستانہ جات کی مختلف علامات ونشانیوں میں ماضی کی ایک مستقل تاریخ پنہاں ہے۔ اسے لفظی گورکھ دھندوں سے تعبیر نہ کیا جائے۔ بلکہ اگر دیدۂ اعتبار ہو۔ اور شعور و آگہی نے آپ کا ساتھ نہ چھوڑا ہو تو آستانوں کی تاریخی علامات اور اس کی نشانیوں کو دیکھ دیکھ کر مشاہدے کی روشنی میں اپنے اس معاملہ کی توثیق کرتے جائیے جسے آپ نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ جب بات آ ہی گئی ہے تو آئیے چل کر یقین و اعتماد کی یہ دولت حاصل کی جائے۔

دیکھئے یہ اجمیر شریف میں درگاہ روڈ ہے نیچی نگاہیں اٹھائیے یہ سامنے درگاہ معلّٰی ہے جس کا یہ بلند دروازہ! آپ کو معلوم ہے یہ بلند دروازہ نظام حیدرآباد دکن کے غلامی کی نشانی ہے یہاں راجاؤں اور نوابوں سے گذارش

نہیں کی جاتی کہ آپ دروازہ بنوا دیں یا آپ بارہ دری بنوائیں یا آپ گیٹ و لنگر خانہ بنوا دیں۔ بلکہ اپنے اپنے وقت کا سلطان و شہنشاہ خود درخواست گزارتا ہے کہ ہمیں گیٹ بنانے یا ہمیں مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ اچھا ذرا اور آگے بڑھیئے۔ یہ دیکھئے یہ جلال الدین اکبر کی چڑھائی ہوئی دیگ ہے جسمیں بیک وقت نٹو من کا تبرک تیار ہوتا ہے۔ یہ وہ دوسری دیگ ہے جسمیں اٹھی من دلیا پکائی جا سکتی ہے۔

یہ داہنے بازو پر آسمان بولتا گیٹ دیکھئے۔ یہ اکبری گیٹ ہے۔ اور آگے بڑھیئے یہ شاہجہانی مسجد ہے گویا جنت کا کوئی ٹکڑا خاک پر رکھدیا گیا ہے یہ جھالرہ ہے۔ یہ عالمگیری مسجد ہے۔ یہ اولیاء مسجد ہے۔ یہ ڈھائی دن کا جھونپڑا ہے۔ یہ وہ پتھر ہے کہ جب دشمنوں نے اوپر سے پھینکا تھا تو غریب نواز کے گھوڑے نے اپنے پاؤں سے روک دیا تھا۔ دیکھو ابھی تک اس پر گھوڑے کی ٹاپ کے نشانات ہیں۔

یہ وہ پتھر ہے جسے غریب نواز نے اپنے چابک سے روک دیا تھا۔ دیکھو ابھی تک اس پر چابک کا نشان ہے۔ ہاں ہاں یہ وہی اناساگر ہے دشمنوں نے جس کا پانی سلطان ہند پر بند کر دیا تھا۔ اور غریب نواز نے اس کا سارا پانی اپنے معتقد کے ذریعہ چھاگل میں بھروالیا تھا۔ دیکھو وہ مدار ٹیکری ہے۔ وہ تارا گڑھ ہے۔ وہ غریب نواز کا چلّہ ہے۔ غرضیکہ پورا اجمیر تاریخی نشانیوں میں گھرا ہوا ہے۔

مجھے حیرت ہے جن واقعات کو تاریخ کے صفحات پر پڑھا جا سکتا ہے خود انھیں ماتھے کی کھلی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھا جا سکتا؟ ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا، دیکھ

مجھے کہنا یہ ہے کہ اگر آستانہ جات یا دیگر تاریخی مقامات کے آثار

و علائم مٹا دیئے جائیں تو مستقبل میں کسی بھی وقت ان واقعات کو جھٹلایا جا سکتا ہے اور ان کی تکذیب کی جا سکتی ہے۔ ایسے تاریخی دستاویز تو طلسم ہوش ربا یا الف لیلیٰ کی مفروضہ داستان اور من گڑھت کہانیاں تصور کی جائیں گی۔

حضرات! دیکھئے یہ کچھوچھہ مقدسہ ہے یہاں اللہ کا وہ محبوب بندہ آرام فرما ہے جس نے سمنان کی سلطنت اور تخت و تاج اور شاہی کرّ و فر کو پاؤں کی ٹھوکر مار کر درویشی اختیار کی اور آج کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ دیکھئے یہ آستانہ کے مشرقی جانب ایک تھوڑا سا راستہ چھوڑ کر ہر طرف پانی سے گھرا ہوا ہے۔ جسے "نیر" کہا جاتا ہے اور پورے پانی پر "سوار" کی ہری گھاس مخمل کی طرح بچھی ہوئی ہے جو بطور شفا، استعمال کی جاتی ہے۔ غرضیکہ اس کے ساتھ ایک مستقل تاریخ وابستہ ہے۔

یہ بہرائچ شریف ہے جہاں سیدی سالار مسعود غازی آرام فرما ہیں۔ قدم قدم پر ماضی کی نشانیاں دیکھتے جاؤ۔ اور عہد رفتہ کی یادوں سے اپنے اسلاف کی پاکیزہ اَزْواح کو بلندیٔ درجات کی دعائیں دیتے جاؤ۔ یہ وہ آستانہ ہے جہاں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم لاکھوں کی تعداد میں حاضر ہوتے ہیں۔ بلکہ میلہ میں کئی لاکھ غیر مسلموں ہی کی ہماہمی رہتی ہے۔

حضرات! جب سخن گسترانہ بات آہی گئی ہے

تو دل یہ چاہتا ہے

کہ صرف چند منٹ کے لئے اپنے معینہ عنوان سے ہٹ کر آج کے ایک ابھرے ہوئے مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔ چونکہ بعض لوگوں نے آج قبر پہ حاضری کو ہماری تضحیک اور اپنے مشن کی تشہیر کا ہتھکنڈا بنا رکھا ہے۔ لہٰذا معذرت کے ساتھ میں آپ سے عرض کروں گا کہ اس عنوان سے متعلق چند گوشے سماعت فرمائیے جب وہ "فرقہ ثنائیہ" قبر ہی کے پیچھے پڑا ہے تو ہم بھی چاہتے ہیں کہ آج اسے سیدھے قبرستان ہی تک پہونچا دیا جائے۔ جہاں سے پھر وہ واپس نہ آسکے۔

حضرات! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ قبر پر جانا شرک و بدعت ہے اب اس سلسلے میں، میں آپ کو ایک بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ "صاحب خصائص کبریٰ" حضرت جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ:۔

ایک بار آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کسی راہ سے گذر رہے تھے قریب ہی میں والدہ ماجدہ کی قبر تھی۔ سرکار نے ارادہ فرمایا کہ والدہ ماجدہ کی قبر پر حاضری دی جائے۔ جیسے ہی دل میں خیال گذرا۔ جبریل امین حاضر دربار ہوئے عرض کیا یارسول اللہ! اگر آپ چلنا چاہیں تو تشریف لے چلیں۔ چنانچہ والدہ کریمہ کی قبر پاک پر تشریف لائے۔ تشریف لانے کے بعد اپنے ہاتھوں کو جیسے ہی اٹھانا چاہا۔ جبریل پھر حاضر ہوگئے۔ عرض کیا یارسول اللہ! ہاتھ نہ اٹھائیے۔

اس سے ایک گمراہ اور بھی زیادہ گمراہی کے دلدل میں پھنس گیا۔ اور اس نے معاذ اللہ یہ کہنا شروع کیا کہ آپ کی والدہ قابل بخشائش تھیں ہی نہیں۔ اسلئے ہاتھ اٹھانے سے روک دیا گیا۔

گویا اس بدبخت نے اپنی ماں پر مصطفےٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ وسلم کی ماں کو قیاس کیا۔ جیسا کہ اصول ہے المرء یقیس علی نفسہ۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا محبت و عقیدت سے بھرا ہوا جواب عطا فرمایا :۔

فرماتے ہیں اسلام کا ابھی ابتدائی دور تھا۔ اگر سرکار کو ہاتھ اٹھانے دیا جاتا تو ہو سکتا تھا کہ دشمنان مصطفےٰ طعنہ دیتے کہ نبی کی والدہ اسوقت بخشی گئیں جب نبی نے اپنا دست کرم اٹھایا۔ مگر قدرت کو یہ کب گوارہ ہو کہ کوئی دریدہ دہن گستاخ و بے ادب نبی کا دل دکھائے اور ان کی دل آزاری کرے۔

دوستو! بات یہ نہ تھی بلکہ اصل بات وہ ہے جیسے علامہ جلال الدین، سیوطی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ اگر آج سرکار نے ہاتھ اٹھایا تو اندیشہ تھا کہ کل کہیں لوگ یہ کہنا نہ شروع کر دیں کہ نبی کی والدہ اس وقت بخشی گئیں جب نبی نے اپنا ہاتھ اٹھایا مقصد یہ ہے کہ یا رسول اللہ اب آپ اس کی تکلیف نہ اٹھائیں۔ آپ کا نور جن جن اصلاب وارحام سے گذرتا گیا سب کو نور بناتا گیا۔

ایک واقعہ ایک بار ایک صحابی نے اپنی لونڈی کو حکم دیا کہ دسترخوان صاف کر ڈالو۔ چنانچہ خادمہ اسے لے کر آگ کے تنور تک پہونچی اور ایک گوشہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر باقی سب کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیا۔ اور چند لمحے بعد اسمیں سے اس کپڑے کو نکالا تو وہ دھلا دھلایا بالکل صاف شفاف نکلا آقا نے خادمہ سے کہا میں نے تم کو دھونے کے لئے کہا تھا اور تو نے اس کو شعلے کی لپیٹ میں ڈال دیا۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ خادمہ نے عرض کیا۔ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ پانی کا کام دھونا اور آگ کا کام جلانا ہے۔

مگر میں نے ایک روز ایسا دیکھا تھا کہ میرے سرکار نے اسی دسترخوان سے اپنی انگلیاں صاف فرمائی تھیں تو میرا ایمان اور عقیدہ بول رہا تھا کہ جس پر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی انگلی پڑ گئی۔ اس پر آگ اثر نہیں کر سکتی۔ چنانچہ آج اس کا مشاہدہ بھی ہو گیا اور شبہات بھی رفع ہو گئے۔ یعنی دسترخوان تو نہ جلا البتہ وہ شبہات جل کر خاکستر ہو گئے۔

تو اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ جس چیز پر آقائے دوجہاں کی انگلیاں پڑ جائیں اس پر آگ نہیں اثر کرسکتی۔ تو بھلا جس شکم مادر میں نو مہینے مسلسل نور مصطفےٰ اپنی جلوہ ریزی وضیا پاشی کی ہو اس پر آگ کیوں کر اثر کرسکتی ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔

حضرات! اس سے معلوم ہوا کہ ہم نے رسول اللہ کو حضرت آمنہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی قبر پر دیکھا۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہدائے احد کی قبر پر دیکھا۔

اچھا تو آپ لوگ یہ بتائیے کہ نبی اس دنیا میں مبعوث کیوں کیا جاتا ہے؟ شرک پھیلانے کے لئے یا شرک مٹانے کے لئے۔؟

جواب۔ شرک مٹانے کے لئے۔

لہٰذا آپ خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اگر قبروں پر جانا شرک ہوتا تو وہ نبی جو شرک مٹانے کے لئے آیا تھا وہ بھلا قبروں پر کیسے جاسکتا تھا۔

اگر قبروں پر جانا شرک ہوتا تو منصب رسالت ونبوت کے خلاف ہے کہ قبر پر نبی کو دیکھا جائے۔

معلوم ہوا کہ قبر والوں کو بھلایا نہیں جاتا بلکہ ان کو یاد رکھا جاتا ہے۔ جو لوگ قبروں کے مخالف ہیں مریںگے تو بہر حال۔ مگر ان کی قبروں پر آدمیوں کے بجائے کچھ اور نظر آئیںگے۔

حضرات! جب بات آ ہی گئی ہے تو دو ایک واقعہ اور سماعت فرمائیں آفتاب نبوت کے غروب ہونے کے بعد لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی قبر پر دیکھا پھر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا وصال ہوا تو امیرالمومنین خلیفۃ المسلمین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو سرکار کے آغوش میں سپرد لحد کیا گیا۔ اب حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو دونوں قبروں پر دیکھا گیا۔

لہٰذا اب عہد فاروقی ہے۔ چنانچہ حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے وصال کے بعد اب حضرت عائشہ صدیقہ کو تینوں قبروں پر حاضری دیتے دیکھا گیا۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ خلیفۂ دوم حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے دفن ہو جانے کے بعد اب حضرت عائشہ صدیقہ نے چہرے پر نقاب ڈال لیا تھا۔

لوگوں نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا سب سے پہلے میرے شوہر کی قبر تھی۔ ان سے پردہ کیسا۔ اس کے بعد میرے والد کی قبر تھی ان سے بھی پردہ کیسا۔ البتہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ جیسے غیر محرم سے میں نے پردہ کیا۔

ایک نکتہ: اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اگر دیکھ نہیں رہے ہیں تو ان سے پردہ کیسا؟ بس سمجھ میں آیا جب سرکار کے غلام اپنی قبروں میں زندہ رہ سکتے ہیں تو پھر نبی کی حیات پر مناظرہ و مباحثہ کیسا؟

معلوم ہوا کہ دنیا نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی قبر پر دیکھا۔ اور حضرت صدیقہ کو بھی۔

سلسلۂ رفاعیہ کے مورث اعلیٰ حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے قبر رسول پر حاضری دی۔ صحابۂ کرام نے حاضری دی۔ گویا ہم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر پر دیکھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ کو قبر پر دیکھا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو قبر رسول پر دیکھا۔ ایسے ہی حضرت سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کو جب کسی مسئلہ میں مشکل درپیش آتی تو آپ امام الائمہ حضرت سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مزار مبارک پر حاضری دیتے۔ اور الجھے ہوئے مسئلہ میں صاحب مزار سے استمداد و استعانت چاہتے۔

چنانچہ حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کا کہنا ہے کہ جو مسئلہ کبھی بھی حل نہ ہوتا وہ حضرت سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کی قبر اطہر پر ان کے روحانی فیوض وبرکات سے آن کی آن میں حل ہو جاتا۔ گویا ہم نے امام شافعی رضی اللہ عنہٗ کو حضرت سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کی قبر پہ دیکھا۔ اور اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قبر پہ جانا بھی درست ہے اور ان سے استمداد و استعانت بھی جائز۔ اور یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو گئی کہ صاحب مزار دیکھتے ہیں سنتے ہیں۔ سمجھتے ہیں اور مدد بھی فرماتے ہیں۔

کیا ہو گیا آج کے غیر مقلدین کو، کہ آمین بالجہر اور رفع یدین جیسے مسائل میں تو حضرت سیدنا امام شافعی رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کے مقلد ہیں۔ اور جب قبر پر جانے کی باری آتی ہے تو گنبد خضری کو صنم اکبر کہا جاتا ہے۔

بہرحال ہم نے مالک ہندوستان خواجہ خواجگاں، سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کو حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے مزار پہ دیکھا۔ ہندوستان کے اکابر اولیا اللہ نے اجمیر شریف حاضری دی سلاطین مغلیہ میں اکبر وجہانگیر، شاہجہاں اور حضرت عالمگیر نے حاضری دے کر اکتساب فیض کیا۔

اگر قبروں پر جانے والے یہ سب کے سب مشرک قرار پائیں تو اب اس روئے زمین پر مسلمان کہاں ڈھونڈا جائے۔؟

بہرحال ہم نے قبر پہ جانے والوں کی ایک دستاویز تیار کر دی اگر آپ لوگ اس کی اجازت دیں تو اب اس دستاویز پر ایک آخری مہر لگا دی جائے۔ تاکہ قانونی کارروائی بالکل پختہ ہو جائے۔

حضرات! آپ میں سے بہت سے لوگ حاجی ہوں گے۔ آپ میں سے

کوئی صاحب یہ بتائیں کہ کیا حج کی مقبولیت کی دلیل لے کر آپ آئے ہوئے ہیں؟
کوئی نہیں ۔ کیا معلوم ہوا؟ تین ساڑھے تین مہینے ادائیگی حج کے لئے مکہ مکرمہ میں
رہے لیکن قبولیت نہ مل سکی ۔ مگر میرے آقا جسے رب نے رحمتِ تمام بنا کر بھیجا ان
کا کرم، ان کی شفقت و عنایت دیکھو ۔ وہ فرماتے ہیں :

مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ

جس نے میری قبر کی زیارت کی اس پر میری شفاعت واجب ہوگئی ۔
اب تم لوگ بتاؤ کہ قبر پہ بلایا جارہا ہے یا قبر پر سے بھگایا جارہا ہے
اور صرف بلایا ہی نہیں جارہا ہے بلکہ سرکار کی نظر میں قبر کی حاضری اس قدر محبوب
و پسندیدہ ہے کہ شفاعت کی لالچ دے کر بلایا جارہا ہے ۔ جس طرح بچہ کبھی والدین
کے قریب نہیں آتا ۔ بلانے سے اور گریز کرتا ہے تو اسے بسکٹ اور ٹافی کی لالچ دے
کر بلایا جاتا ہے ۔ کچھ اس طرح کا نقشہ یہاں بھی ہے ۔ اگر ویسے آنا نہیں چاہتے ۔ تو
شفاعت کی لالچ میں آئے ۔ میں تم کو یہ ضمانت دے کر رخصت کردوں گا ۔ کہ کل میں
تمہاری شفاعت کردوں گا ۔ اللہ اکبر ۔

یہ ہے قبر رسول کی حاضری کا صلہ ۔ کہ اگر تم مجھے نہ ڈھونڈ سکو گے تو میں ڈھونڈ
لوں گا ۔

حاجی ایک زخمی دل کے ساتھ واپس ہو رہا تھا سرکار نے یہ بشارت دے کر
اس کے زخموں پہ نمک نہیں چھڑکا بلکہ مرہم رکھ دیا ۔ اس کے باوجود بھی عقل کا اندھا کہتا
ہے کہ قبروں پر نہیں جانا چاہئے ۔

میری ترتیب دی ہوئی دستاویز کی یہ ایک ایسی مہر ہے جس نے اباطیل کی
تابوت میں ایک آخری کیل ٹھونک دی ہے ۔

حضرات ! عنوان کی ایک ذیلی گفتگو میں آپ پر یہ واضح ہو گیا کہ
قبروں پر جانا بھی درست ہے اور ان سے استمداد و استعانت بھی جائز ہے ۔
اس مضمون پر آپ میری دوسری تقریر سماعت فرمائیں ۔

اب آئیے اپنے اصل موضوع سے وابستہ ہو جائیے یعنی یادوں کو مٹایا نہیں جاتا ہے بلکہ اسے برقرار رکھا جاتا ہے جس کی متعدد مثالیں آپ کو فریضۂ حج میں مل جائینگی۔ مثلاً ادائیگی حج میں حاجی "سعی بین الصفا والمروہ" کرتا ہے۔ صفا و مروہ یہ دو پہاڑیاں ہیں جس پر دوڑ کر آدمی سات پھیرے لگاتا ہے۔ صفا سے مروہ پر اور مروہ سے صفا پر۔

اب اگر کوئی اس سے یہ پوچھے کہ حاجی صاحب اگر حج پہاڑیوں پر دوڑنے کا نام ہے تو ہندوستان میں پہاڑ اور پہاڑیوں کی کیا کمی تھی؟ کوہ ہمالہ کھڑا ہے اس پر دوڑ لیتے۔

تو حاجی بڑی سنجیدگی سے جواب دے گا کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت سیدتنا ہاجرہ دوڑ لگا چکی ہیں۔ سائل پھر سوال کرتا ہے کہ حضرت ہاجرہ کیوں دوڑی تھیں؟ حاجی صاحب جواب دیں گے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی مقام پر حضرت ہاجرہ و حضرت اسماعیل علیہما السلام کو چھوڑ گئے تھے۔ حضرت اسماعیل کی زبان شدت پیاس سے باہر نکل آئی۔ نہ کہیں کنواں تھا نہ چشمہ، نہ ندی تھی نہ نالا۔ نہ تالاب تھا نہ دریا۔ حضرت ہاجرہ سے شہزادے کا یہ حال دیکھا نہ گیا تو حضرت ہاجرہ نے پانی کی لالچ میں دوڑ لگایا۔ شاید کہیں پانی کی چند بوند مل جائے یا کسی چشمے یا کنواں کا سراغ لگ جائے۔

سائل پھر سوال کرتا ہے۔ حاجی صاحب حضرت سیدہ ہاجرہ کا دوڑنا تو سمجھ میں آگیا کہ وہ پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں مگر آپ کو پانی کی کیا کمی؟ آج تو مکہ جل تھل ہو گیا ہے۔ آپ کیوں پریشان ہیں؟

حاجی صاحب کا جواب یہی ہو گا کہ میں پانی کی تلاش میں نہیں دوڑ رہا ہوں بلکہ دوڑ لگا کر حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دوڑ لگانے کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔ یہ وہی پہاڑی ہے جس پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک محبوب بندی دوڑ چکی ہیں۔ اگر ہم نہ دوڑیں گے تو ہاجرہ کی یہ ادا مٹ جائے گی۔ اور

اسلام چاہتا ہے کہ اچھوں اور پیاروں کی ادائیں مٹائی نہ جائیں بلکہ ان کو زندہ رکھا جائے۔ اور یہی یاد ان کی تاریخ کو دہراتی رہے گی۔

معلوم ہوا کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی یاد کو مٹایا نہیں گیا بلکہ زندہ رکھا گیا۔ اور حد تو یہ ہے کہ حج جیسے فریضہ کے ارکان میں شامل کر لیا گیا۔ اب اس کے منکرین کو اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل چاہیئے۔؟

اور آگے بڑھئے ارکان حج میں یہ بھی ہے کہ حاجی کو طواف کعبہ بھی کرنا ہے مطاف کعبہ میں سات پھیرے لگانے ہیں۔ حجر اسود کو بوسہ دے کر پھر وہیں آنا ہے پھر وہیں سے چل کر وہیں آئے گا۔

اس طرح اس کو سات چکر لگانا ہے لیکن ان کے سات پھیروں میں تین بار "رَمَل" کرنا ہے یعنی وہ سینہ تان کر اکڑ کر چلے گا۔ چونکہ آقائے کائنات جب صحابۂ کرام کو لے کر طوافِ کعبہ کی غرض سے تشریف لائے تھے تو صحابہ اپنی علالت کے باعث بہت کمزور و نحیف نظر آرہے تھے اس پر کفار مکہ نے بطور طعن کہا کہ ایسے کمزور و نڈھال لوگ کیا طواف کعبہ کریں گے۔ صحابۂ کرام نے یہ بات سید عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تک پہونچائی۔ کہ کفار مکہ ایسا کہہ رہے ہیں۔ اس پر آقائے دو عالم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ جب طواف کرو تو اس میں 'رمل' کرو۔ تاکہ ان پر تمہاری ہیبت کا سکہ جم جائے۔

چنانچہ سرکارِ دوعالم نے بھی 'رمل' فرمایا۔ اور صحابۂ کرام نے بھی۔ اب آج حاجی سے پوچھا جائے کہ تم 'رمل' کیوں کرتے ہو تو اس کا جواب یہی ہوگا، کہ سرکار و صحابہ کی 'رمل' کی وجہ تو وہ تھی جیسے ذکر کیا گیا۔ لیکن ہمارے 'رمل' کی وجہ یہ ہے کہ سرکار کی ادا باقی رہ جائے۔

قدیان بیت گئیں لیکن اس ادا کو مٹنے نہیں دیا گیا۔ اس کے شواہد ملتے جارہے ہیں کہ یادیں مٹائی نہ جائیں بلکہ ان کو زندہ رکھا جائے۔ انھیں کیا زندہ رکھنا ہے۔ بلکہ خود اسیں ہی زندگی کا راز پنہاں ہے۔ گویا تم اگر جینے کی طرح جینا

چاہتے ہو توان یادوں کو مٹاؤ نہیں بلکہ ان کو زندہ رکھو۔

عہد رسالت کی ایک اور بات آپ کو یاد دلائیں۔ ایک بار آقائے دوجہاں صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ اسی اثنا میں بچوں کی ایک ٹولی گذری جواذان کی نقل کر رہے تھے۔ کوئی حی علی الصلوٰۃ کہہ رہا ہے۔ کوئی اللہ اکبر کہہ رہا ہے۔ بچے تو بچے انھیں میں ایک صاحبزادہ ابودردا رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے بھی تھے ان کی آواز بہت پیاری تھی۔

آقائے دوعالم نے اشارہ کر کے ابودردا رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ کو بلایا۔ ان کی پیشانی کے لٹکے بالوں پر دست شفقت پھیرا۔ دعائیں دیں۔ اور رخصت کر دیا۔ شہزادے نے گھر جا کر اس کا تذکرہ اپنی ماں سے کیا کہ آج ہم ساتھیوں کے ساتھ اذان کی نقل کرتے گذر رہے تھے کہ اسی اثناء میں ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے قریب گذرے میرے آقا کی نگاہِ انتخاب کا کیا کہنا بس مجھ کو اپنے قریب بلایا۔ میری پیشانی کے لٹکے بالوں پر اپنا دست کرم رکھا۔ اور دعائیں دے کر رخصت فرمایا۔ وہ صحابیہ ماں سنکر جھوم گئیں۔ اور فرمایا بیٹے، زندگی میں خواہ کتنی ہی بار بال منڈواؤ یا ترشواؤ مگر خبردار خبردار ان بالوں کو نہ مونڈوانا جس پر رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ہاتھ پڑ گئے ہیں۔

ان کو بطور تبرک اور یادگار چھوڑ دو تاکہ اس بات کی نشانی رہے کہ یہ وہ بال ہے جس پر آقائے دوجہاں نے دست شفقت پھیرا ہے۔ اس کے توسل سے خدا سے دعائیں مانگی جائیں۔

غور فرمائیے !! اس عہد کا عقیدہ تھا کہ یادگاروں کو مٹایا نہ جائے بلکہ اس کو باقی رکھا جائے۔

واضح رہے کہ جن بالوں پر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی انگلیاں

پڑجائیں۔ تو ان بالوں کو نہیں مٹایا جا سکتا تو جس دن آقائے دو جہاں صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے اپنے قدم میمنت لزوم سے اس خاکدانِ گیتی کو نوازا جو آپ کا یوم ولادت ہے۔ بھلا عقیدت کیش اور خوش عقیدہ مسلمان اس دن کو مٹنا کیسے برداشت کر لے گا۔

وہ اسلامی نقطۂ فکر کو خوب اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے کہ اسلام کا یہ دیا ہوا ذہن و مزاج ہے کہ تاریخی دنوں کو مٹایا نہیں جاتا۔ بلکہ انھیں زندہ رکھوا جاتا اسی میں ہماری قومی زندگی کا راز مضمر ہے۔ اور کوئی بھی زندہ و بیدار مغز قوم اپنی سنہری تاریخ کا چہرہ مسخ ہوتے برداشت نہ کرے گی۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ آج اگر کوئی مسلمان اپنے اسلاف کی یادیں مناتا ہے تو یہ کوئی مفروضہ یا اختراع محض نہیں بلکہ یادوں کا منانا یہ ایک ایسی زندۂ جاوید حقیقت ہے جسے اسلام نے ہمیشہ کے لئے اپنے کلیجہ سے لگا رکھا ہے۔

حضرات! اختتام گفتگو پر ایک واقعہ اور ملاحظہ فرمائیے:

اکابر سلسلۂ چشتیہ میں آپ نے سلطان چراغ الدین دہلوی اور حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز رضی اللہ تعالے عنہما کا نام نامی سنا ہوگا۔ حضرت سلطان نصیر الدین چراغ دہلوی، دہلی میں آرام فرما ہیں۔ اور بندہ نواز قطب دکن کی حیثیت سے گلبرگہ شریف میں روحانی فیوض و برکات لٹا رہے ہیں۔ جہاں پر صبح و شام آنے جانے والے زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انھیں گیسو دراز کیوں کہا جاتا ہے؟

ایک بار بندہ نواز بیٹھے تھے اور اسی طرف سے آپ کے پیر و مرشد حضرت سلطان چراغ دہلوی گھوڑے کی سواری سے گذرے۔ حضرت بندہ نواز دیکھتے ہی مرشد برحق کی جانب لپکے اور بڑھے۔ اور آ کر زانوئے مبارک کا بوسہ دیا۔ پیر نے فرمایا اور جھک کر۔ چنانچہ دوبارہ جھک کر تلوے کو چوما۔ فرمایا اور جھک کر۔ پھر گھوڑے کی رکاب کو بوسہ دیا۔ فرمایا اور جھک کر پھر گھوڑے کی سُم یعنی

ٹاپ کو چوما۔ ہر بار کے جھکنے میں پیر نے نہ جانے کتنے مراتب طے کرا دیئے اور کتنے درجات کی بلندی عطا فرمائی۔

چنانچہ چوتھی بار سم کو بوسہ دینے کے لئے بندہ نواز جھکے تو رکاب میں بال الجھ گیا حتی کہ سم کو بوسہ دینے کے لیے جھکتے گئے اور بال بڑھتا گیا۔ چونکہ پیر کی اطاعت میں یہ بال بڑھے تھے لہٰذا بطور یادگار لمبے بالوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اسی لئے ان کو گیسو دراز کہا جاتا ہے۔

ان تمام واقعات سے پتہ چلا کہ بزرگوں، اسلاف اور تاریخ ساز ہستیوں کی یادوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ انہیں برقرار رکھا جاتا ہے اور یہی ہمارا مضمون ہے

اب آئیے ایک پتے کی بات بتا دیں۔ ایک یادان لوگوں کی بھی ہے اور وہ ہے "رمی جمار" ارکان حج میں ایک رکن یہ بھی ہے کہ شیطان کو کنکری ماری جاتی ہے۔ رمی کے معنی پھینکنے کے ہیں۔ جمار کے معنی کنکری۔ اسی لئے اس کو رمی جمار کہتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شیطان سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ کو بہکانے جا رہا تھا۔ جب خدا کے حکم سے حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ اپنے نور نگاہ حضرت سیدنا اسماعیل کو ذبح کی غرض سے لے چلے تھے تو شیطان بھی پیچھے لگ گیا تھا۔ اس نے حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السّلام سے طرح طرح کے سوالات کئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السّلام نے اس کے جوابات مرحمت فرمائے۔ آخر شیطان نے ترکش کا آخری تیر پھینکا اور کہا کہ تمہارا باپ تمہیں ذبح کرنے کی غرض سے لئے جا رہا ہے۔ اس نے سمجھا تھا کہ جان تو سبھی کو پیاری ہوتی ہے یہ سنتے ہی اسماعیل کا قدم ڈگمگا جائے گا۔ مگر نبی زادے نے برجستہ جواب دیا۔ موت برحق ہے۔ مگر اس وقت کتنی پیاری ہوگی کہ بیٹا باپ کے ہاتھوں ذبح کیا جائے۔ بیٹا دم توڑ رہا ہو اور باپ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہو۔

شیطان اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور مایوس ہو گیا۔ اور سوچا یہاں کوئی جادو کام نہیں کر سکے گا۔

چنانچہ اسلام نے حاجیوں پر لازم قرار دیا کہ وہ یہاں آکر رمی جمار کریں یعنی شیطان کو کنکری ماریں وہاں شیطان کا پتلا نہیں ہے۔ یہ رکن صرف اسلئے ادا کیا جاتا ہے کہ حضرت خلیل اللہ اور حضرت ذبیح اللہ کی یاد باقی رہ جائے۔

مگر مجھے حیرت ہے کہ آج تک ہمارے حریف نے اس کے خلاف سعودیہ عربیہ سے کوئی احتجاج نہیں کیا کہ صدیوں سے ہمارے لکڑ دادا پر پتھراؤ ہو رہا ہے اب تو ان پر رحم کیا جائے۔ سر پر کوئی بال تک نہیں رہ گیا ہوگا۔ جب آپ کے عہد میں بھی ایسا نہ ہو سکے گا تو پھر کبھی نہیں ہوگا۔ وہ تو آپ کے بھی مائی باپ ہیں۔

اس کا فلسفہ آپ جانتے ہیں کہ ان کے کان پر کیوں جوں تک نہیں رینگتی محض اسلئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ سنیوں کی تو بہت سی یادیں ہیں جب دیکھو غوث کی یاد ہے، خواجہ کی یاد ہے۔ امام حسین کی یاد ہے۔ حضرت اویس قرنی کی یاد ہے۔ امام اہلسنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی یاد ہے مگر ہماری تو بس یہی ایک یاد ہے اگر یہ بھی مٹ گئی تو پھر ہم کہیں کے نہیں رہینگے معلوم ہوا جو جیسا ہوتا ہے اس کی یادیں بھی ویسے ہی منائی جاتی ہیں۔

غوث و خواجہ محبوب خدا ہیں۔ لہٰذا ان کی فاتحہ دلائی جاتی ہے۔ لوگ ان کے نام کا تبرک کھاتے ہیں۔ بریانی، زردہ، دلیا، کھچڑا، حلوہ وغیرہ۔ مگر شیطان دشمن خدا ہے تو اس پر پتھراؤ کیا جاتا ہے۔ تاکہ اسی سے سمجھ میں آجائے کہ کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔

ایک نکتہ:۔ حضرات! ضمنی طور پر حضرت اسماعیل کا ذکر آگیا تھا کہ شیطان نے بہکانا چاہا مگر ان کے قدم میں لغزش و ڈگمگاہٹ تک نہ آئی۔ وہ جادۂ استقامت پر علیٰ حالہ باقی رہے۔

آپ غور فرمائیں کہ حضرت اسماعیل میں یہ شجاعت و دلیری یہ توانائی

و بہادری کہاں سے آئی۔؟ مجھے کہہ لینے دیجئے حضرت اسماعیل اس نور کے امین ہیں جو کبھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے صلب میں تھا۔ جس نے ابراہیم خلیل اللہ کو نارِ نمرود سے بچایا تھا۔ وہ انگارے ان پر انگارے نہ رہ گئے بلکہ پھول سے بھی زیادہ نرم و نازک اور برف سے کہیں زیادہ ٹھنڈے ثابت ہوئے۔ یہ سب نورِ مصطفےٰ کی بدولت ہے لیکن اب حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السّلام اس نور کے امین بن گئے تھے۔

حضرت اسماعیل اس حقیقت کو جانتے تھے کہ اگر میں ذبح کر دیا گیا تو یہ تنہا میرا ذبح نہ ہوگا۔ بلکہ آسمان کے ستارے جھڑ جائیں گے۔ سمندر خشک ہو جائے گا۔ پہاڑ روئی کا گالا اور آسمان ریزہ ریزہ ہو جائیگا اسلئے کہ میں تو اس نور کا امین ہوں کہ یہ کائنات جس کے لئے بنائی گئی ہے اور جس کے صدقے میں بنائی گئی ہے۔ ابھی تو اس کا ظہور ہوا ہی نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ذبح میرا تنہا نہ ہوگا بلکہ کائنات تہ و بالا ہو جائے گی اور قیامت سے پہلے ایک قیامت آجائے گی۔

لہٰذا ان کے لئے طمانیت و سکون اسی نور پاک کا بخشا ہوا ہے جسے قدرت نے انھیں ودیعت کر دیا ہے۔ فالحمدُ للہ علیٰ ذٰلک۔

ان متعدد مثالوں میں آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اسلام یادوں کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ ان کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

دوستو! اب مجھے ایک بات بتاؤ۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح کہا جاتا ہے تو کیا سچ مچ وہ ذبح کر دیئے گئے تھے۔ اسلامی گھرانے کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ حضرت اسماعیل ذبح نہیں ہوئے بلکہ ان کی جگہ رب تبارک تعالےٰ نے ایک جانور بھیج دیا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السّلام کی چھری چل رہی تھی۔ آنکھوں پر پٹی بندھی تھی وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں خدا بندوں کی نیت پر مطلع ہے۔ ہم کام دیکھ لیں تو حکم لگائیں۔ مگر خدا بندوں

کی نیت اللہ سے بھی زیادہ جانتا ہے۔ جتنا خود بندہ نہیں جانتا۔
چنانچہ رب نے اس قربانی کو منظور کر لیا کہ باپ بیٹے یعنی خلیل و ذبیح دونوں کے دونوں اپنے ارادے میں سچے اور پکے ہیں۔
بھائیو! مگر یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے کہ حضرت اسماعیل ذبح نہیں ہوئے بلکہ جانور ذبح ہوا۔ چونکہ وہ جانور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے عوض ذبح ہوا تھا۔ لہٰذا اس کے ذبح کی نسبت خود حضرت اسماعیل کی طرف کر دی گئی۔ اس طرح کا استعمال تو ہمارا اور آپ کا روزمرّہ کا ہے مثلاً ایک باپ اپنے بیٹے کی موت پر کہتا ہے "ارے میں خود مر گیا" وہ واقعتہً مر نہیں گیا بطور مجاز بول رہا ہے۔
اب اگر آپ لوگوں سے کوئی پوچھے کہ حضرت عید اضحیٰ اور عید قرباں کیا ہے تو اب اس کا مشترکہ جواب ہو گا کہ اس مقدس و پاکیزہ تہوار میں ہم لوگ اپنے اللہ کے برگزیدہ و مقبول نبی حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ و حضرت سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ کی یاد مناتے ہیں۔ تاکہ اللہ کی راہ میں نہ صرف مال خرچ کرنے کا ہی جذبہ ہو بلکہ جان تک دینے کا حوصلہ زندہ و سلامت رہے۔
اگر یہ یادیں ہماری اسلامی زندگی سے نکال دی جائیں تو ہماری زندگی مفلوج و معطل ہو کے رہ جائے۔
اسی لئے تو اسلام یادوں کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ اسے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ ذہن کی کشادگی، روح کی بالیدگی، اعمال میں تقویٰ، نگاہ کی بلندی، بازوؤں میں قوت، احساس کی برتری، فکر کی توانائی، حوصلے کی بلندی، غرور سے نفرت، تواضع سے محبت، دنیا سے بے رغبتی، دین سے وابستگی۔

غرضیکہ یہ ساری دولتیں انھیں یادوں کے کشکول میں اکٹھا ہیں یادیں مناتے جاؤ اور تہی دامنی دور ہوتی جائے۔ کچھ خواجہ کے در سے لو، کچھ شہنشاہ بغداد سے، کچھ کلیر سے تو کچھ کربلا سے، کچھ مارہرہ سے تو کچھ بریلی سے۔ بہرحال جب تک ان کی یادیں مناتے رہو گے زندگی سنورتی اور نکھرتی رہے گی۔ اور جب ان سے روگردانی کروگے تو یا تو کولھو کے بیل بن جاؤ گے یا کچھ اور۔ دھوبی کا گدھا، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر پوچھا جائے کہ عید اضحیٰ، عید قرباں کیا ہے؟ تو آپ یہی جواب دیں گے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ و حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی یاد ہے۔

حضرات! اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ حضرت اسماعیل ذبح نہیں ہوئے مگر اسلام نے ان کی اس قربانی کو اتنی اہمیت دی کہ مستقلاً اسے ایک تہوار بنا دیا۔ تاکہ سال بہ سال ہم ان کی یادیں مناتے رہیں جس سے رگوں میں نئی حرارت اور نئی زندگی کے آثار نمودار ہوں۔

لہٰذا اب مجھے کہنے دیجئے کہ حضرت اسماعیل ذبح نہیں ہوئے مگر پھر بھی اسلام ان کی یاد مناتا ہے۔ یا للعجب! کہ کربلا میں جانور نہیں ذبح کئے گئے۔ بلکہ نواسۂ رسول جگر گوشۂ بتول، علی اصغر، علی اکبر، قاسم و عون و محمد کی لاشیں کربلا میں تڑپیں تو کیا اب بھی آپ مجھے نہ کہنے دیں گے کہ جو حضرت ابراہیم کے شہزادے کی یاد منا سکتا ہے وہ نواسۂ رسول کی یاد منانے پر کیوں کر پہرہ بٹھا سکتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم کے شہزادے کی یاد منائی جا سکتی ہے تو بدرجۂ اولیٰ مصطفیٰ کے نواسوں کی بھی یاد منائی جا سکتی ہے۔

وہ کیسے شقی القلب، کج فکر و کج فہم ہیں جو یاد حسین و یوم حسین پر بندش

لگانا چاہتے ہیں۔ اے عقل کے دشمنو! اگر ان مراسم میں عوام کے افکار و خیالات اور اعمال و کردار میں کچھ خامیاں آگئی ہوں تو ان کا ازالہ کرو۔ ان کے مٹانے کی کوشش کرو۔ لیکن اصل تاریخ کربلا پر تو دھول مت جھونکو۔ اس پر ایسی تیشہ کاری نہ کرو کہ واقعات کی اصل صورتیں مسخ ہو جائیں۔

اب تمہاری جرأت بیتاب اپنے حدود سے اس قدر تجاوز کر گئی ہے کہ یزید تو برحق اور حسین ناحق کہنے لگے۔ اور یزید کو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہنے لگے۔ ٹھیک ہے اگر تمہاری نظر میں یزید برحق تھا تو قیامت کے بعد وہیں رہنا جہاں یزید کا ٹھکانا ہو۔

حضرات! میں نے بہت زیادہ آپ کا وقت لے لیا۔ آج کے عنوان کے لئے میں نے قرآن کی یہ آیت کریمہ تلاوت کی تھی

واتخذوا من مقام ابراہیم مصلی

اب مجھے کہہ لینے دیجئے مکمل دستاویز کی آخری مہر ہے جس سے مجال انکار نہیں۔ گھر خدا کا ہے اور نقش قدم خلیل کا۔

اگر یادوں کا منانا جرم ہوتا تو قرآن نہ کہتا کہ مقام ابراہیم کو اپنی سجدہ گاہ بناؤ۔ بلکہ یہ کہا جاتا کہ اللہ کے گھر سے اسے الگ کیا جائے۔ لیکن کوئی اور نہیں۔ خدا خود فرماتا ہے کہ کہیں اور نہیں میرے ہی گھر میں میرے محبوب کا نقش قدم رہنے دو۔ تاکہ معماروں کی حیثیت سے ان کی یاد ہمیشہ کے لئے قائم و دائم رہے۔

عمر تمام رفت بسیا تا قصنا کنیم
عمریکہ بے حضور صراحی و جام رفت؟

سراج منیر

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

امّا بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے "سراج منیر" میں نے معمول کے مطابق، قرآن حکیم کے ایک مقدس حصے کی تلاوت کی ہے وداعیا الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا۔

حضرات! میرا ہی نہیں، بلکہ قریب قریب ہر خطیب کا یہی معمول ہے کہ ایک دینی و مذہبی اسٹیج کے لئے وہ "قرآن مجید" کی کسی بھی آیت کو اپنی تقریر کا زیب عنوان قرار دیتا ہے۔

چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اسی طرح ہر خطیب کا یہ بھی معمول ہے کہ تلاوت کی ہوئی آیت کا پہلے ترجمہ کرتا ہے پھر اس کی تشریح و توضیح۔ مجھے بھی معمول کے مطابق ایسا ہی کرنا چاہئے۔ مگر میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ وہ کون سا ایسا داعیہ ہے جو آج مجھے اپنی متعین و مقررہ روش سے گریز کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

لہٰذا آج میں پہلے آیت کا ترجمہ نہ کروں گا بلکہ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ ترجمے سے پہلے آج ہم اور آپ سب مل جل کر اس کا فیصلہ کریں کہ خود

"قرآن حکیم" سے متعلق مسلمانوں کا اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور اس سلسلے میں خود اس کی اپنی حتمی رائے کیا ہے؟

میں اس بحث کو قصداً اس لئے اٹھا رہا ہوں کہ اگر ہم نے "قرآن" سے متعلق کوئی آخری اور قطعی فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو گئے تو آیت کا مفہوم سمجھنے میں ہمیں بڑی مدد مل جائے گی۔

لہٰذا ہم اپنی اس سہولت کو رائیگاں جانے دینا نہیں چاہتے لہٰذا اب کسی اور سے نہیں بلکہ یہ سوال خود قرآن ہی سے کیا جائے کہ اے قرآن تو کیا ہے؟

حضرات! اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس سوال کا جواب میں دیدوں، یا آپ میں سے کوئی اس کو حل کرے۔ لیکن میں ایسا بھی نہیں چاہتا۔ ہمارا اور آپ کا جواب تو ہلکا پھلکا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ خود "قرآن" ہی سے اس کا جواب حاصل کیا جائے۔ اگر قرآن نے خود اپنے منصب کو ظاہر کر دیا تو یہ جواب ہر جواب سے وزنی، قابلِ قبول اور مستند ہوگا۔ لہٰذا اب آئیے ہم قرآن ہی سے سوال کریں کہ اے قرآن تو کیا ہے۔

حضرات! اگر قرآن سے یہ سوال کیا جائے کہ تو کیا ہے، تو قرآن کا یہ کہنا ہے کہ اے لوگو! تم مجھے قرآن کہو، عرشی مجھے قرآن کہے فرشی مجھے قرآن کہے، معقولی مجھے قرآن کہے، ایک ادیب مجھے قرآن کہے، صوفی اور درویش مجھے قرآن کہے، محاذ جنگ کا سپہ سالار، اور عابد شب زندہ دار مجھے قرآن کہے، درگاہی، خانقاہی مجھے قرآن کہے حاجی و نمازی مجھے قرآن کہے اپنے اور بیگانے مجھے قرآن کہیں غرضیکہ ساری کائنات مجھے قرآن کہے لیکن اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کیا

ہوں تو سن لو زمین و زماں، فرش و عرش، ملک و فلک اور جن و بشر سب مجھے قرآن کہیں لیکن اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو میرا کہنا ہے کہ میں بیانِ ادا ہوں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا۔

حضرات! یہ تو نہ لفظوں کا زور ہے اور نہ ہی الفاظ کا گورکھ دھندا۔ میں دلائل و براہین سے ہٹ کر فن خطابت کا جادو جگانا نہیں چاہتا جس کی حیثیت ریت کے دیوار یا شیش محل جیسی ہو۔ اردو کی کتابوں تک کا سہارا لینا نہیں ہے۔ بلکہ میں اس کے شواہد خود قرآن ہی سے پیش کروں گا۔

اب آئیے، قرآن حکیم کے پاس۔ میں آپ سب سے دریافت کرتا ہوں، بتائیے یہ کیا ہے لا اقسم بھذا البلد ۔ وانت حل بھذا البلد یہ قرآن ہی تو ہے۔ قرآن ہی کی ایک آیت ہے۔

حضرات! قرآنی شواہد پیش کرنے سے پہلے آپ یہ ذہن نشین فرمالیں کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں کہ "قرآن" میرے مصطفیٰ کا بیانِ ادا ہے۔ دیکھئے ہوتا کیا ہے!

چلنا مصطفیٰ کا، بتانا خدا کا۔ اسی کا نام قرآن ہے۔ سفر مصطفیٰ کا، بتانا خدا کا۔ اسی کا نام قرآن ہے۔ ہاتھ مصطفیٰ کا بتانا خدا کا اسی کا نام قرآن ہے۔ اداس ہونا مصطفیٰ کا، بتانا خدا کا اسی کا نام قرآن ہے۔ علم مصطفیٰ کا بتانا خدا کا اسی کا نام قرآن ہے۔ چہرہ مصطفیٰ کا بتانا خدا کا اسی کا نام قرآن ہے۔

پیارے! قرآن الٹو تو سہی دیکھنے کی طرح دیکھو تو۔ پڑھنے کی طرح پڑھو، سمجھنے کی طرح سمجھو، غور کرنے کی طرح غور کرو۔ تب راز کھلے گا کہ اس آئینے میں صورت کس کی نظر آرہی ہے، چہرہ کس کا ابھرا ہوا ہے، تجلی کس کی پھوٹ رہی ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں؟ جب صحابہ

کرام نے، حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دریافت کیا کہ سرکار کا اخلاق کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا "کان خلقہ القرآن"، ان کا خلق قرآن ہی تو ہے۔

معلوم ہوا آئینہ رخسار مصطفیٰ میں قرآن کی تلاوت کی جائے جبیں مصطفیٰ کی ابھری ہوئی لکیروں میں قرآن کی تفسیر پڑھی جائے اور صحیفۂ آسمانی میں مصطفیٰ کی خاموش اداؤں کا نظارہ کیا جائے اسی لئے میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن کو سمجھنا ہے تو مصطفیٰ سے پوچھو۔ اور مصطفیٰ کو سمجھنا ہے تو تقویۃ الایمان "سے نہیں بلکہ قرآن سے پوچھو۔ اس سلسلہ میں اگر یہ رشتہ آپ نے برقرار رکھا تو انشاء اللہ تعالیٰ کم از کم آپ سے قریب نہ ہو سکے گی، اور عصر حاضر کے دجالوں کی فتنہ سامانیوں سے آپ بال بال بچ جائیں گے۔

حضرات! گفتگو یہ چل رہی تھی کہ میں اپنے دعوے کی دلیل میں اردو کی کتابوں کا سہارا نہ لوں گا، بلکہ خود قرآن ہی سے اس کے شواہد پیش کروں گا۔ چنانچہ اب آپ تمام حضرات فرمائیں یہ کیا ہے لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ یہ قرآن ہی کی ایک آیت تو ہے، قرآن ہی تو ہے۔

اب غور فرمائیے! کہ آخر یہ ہے کیا، کہ اللہ کے رسول نے چلنے کا ارادہ فرمایا، زمین نے اپنا کلیجہ بڑھایا، فرش راہ نے اپنی پلکیں بچھائیں، رہ گزر نے اپنی پیشانی بچھائی، سرکار کہیں ادھر سے گذرو میرے کلیجے پر قدم رکھو، میری پلکوں کو روند دو، میری پیشانی پر اپنا تلوا رکھ کر سر بلندی و سرفرازی عطا کرو۔ سرکار نے قدم بڑھایا، شاہراہیں قدم بوس ہوئیں، پگڈنڈیوں نے تلوے چومے کنکریوں نے اپنے کو موم بنا کر کلیجے پر ہمیشہ کے لئے نشانِ کفِ پائے مصطفیٰ لے لیا۔

اسی کو سرکار آسی نے فرمایا ہے

نہ میرے دل، نہ جگر پر، نہ دیدۂ تر پر
کرم کریں تو نشانِ قدم ہو پتھر پر

اعلیٰ حضرت نے فرمایا:

کھائی قرآں نے خاکِ گذر کی قسم
اس کفِ پا کی حرمت پہ لاکھوں سلام

حضرات! میں یہاں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قدم ناز بڑھایا تو جس زمین نے سرکار کا تلوا چوما اب پروردگار اسی زمین کی قسم یاد فرماتا ہے: لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ اس شہر کی قسم جس نے میرے محبوب کا تلوا چوما۔

حضرات! میرا کہنا ہی ہے چلنا مصطفےٰ کا، سنانا خدا کا نام اسی کا قرآن ہے۔ اگر آپ کو بھروسہ نہ ہو تو کل کی صبح اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان کا ترجمۂ قرآن "کنز الایمان" ملاحظہ فرما کر اس کی تصدیق وصحت کر لیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کسی گمراہ کا ترجمہ نہ دیکھے گا جس گمراہ نے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى کا ترجمہ یہ کیا کہ جب تمہارے رب نے تمہیں گمراہ پایا، بھٹکا ہوا پایا تو راہ دی معاذ اللہ۔

عشق ومحبت سے لبریز "کنز الایمان" کا ترجمۂ قرآن ملاحظہ فرمائیں اے محبوب ہم نے آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔

ایک نکتہ:- حضرات! اس قسم پر ایک بہت ہی لطیف بات یاد آگئی توجہ چاہتا ہوں کیا آپ کو معلوم ہے کہ شریعت اسلامیہ میں

"قسم شرعی" کیا ہے؟ غلاف کعبہ کی قسم کھانا، ہرگز یہ قسم شرعی نہیں ہے کہ جس کے حانث ہونے یا قسم توڑنے سے کفارہ لازم آئے بلکہ قسم شرعی یہ ہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں۔ اگر دارالقضاۃ میں قاضی مدعا علیہ سے قسم لے گا تو جیسا ضابطہ ہے فقہ حنفی کا "البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر" یعنی مدعی سے قاضی دعویٰ کی شہادت طلب کرے گا اور جب وہ شہادت و بینہ پیش کرنے سے عاجز آ جائے تو قاضی پھر مدعا علیہ کو قسم کھلائے گا تو کیا قاضی قرآن کی قسم کھلائے گا؟ غلاف کعبہ کی قسم کھلائے گا؟ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ کہے گا "اللہ کی قسم کھاؤ"

قربان جائیے میرے مصطفےٰ پر کہ پوری دنیائے اسلام کو جب قسم شرعی کی تعلیم دیں تو یہ فرمائیں کہ تم اللہ کی قسم کھاؤ۔ اور جب کائنات کا پروردگار قسم یاد فرمائے تو اس شہر کی قسم جس نے رسول اللہ کے قدم ناز کو چوما ہے۔

کہاں ہیں اپنے جیسا بشر کہنے، سرکار سے اپنا کاندھا ملانے والے، ارے! ان کے تلوے کا مقام اتنا اونچا جہاں تک بڑے سے بڑوں کا سر نہ پہونچے، پھر ان سے کاندھا ملانا اپنے جیسا بشر کہنا مساوات و برابری کرنا، یہ تو "مینڈک کو زکام ہوا" والی کہاوت ہے۔ یہ حوصلہ کہ چیونٹی چلی ہیرا پنچنے کو۔

حضرات! ابھی سلسلۂ تمہید ختم نہیں ہوا۔ بات یہ چل رہی ہے کہ قرآن میرے سرکار کا بیان اداء ہے۔

بتانا خدا کا، نام اسی کا قرآن ہے۔ مثلاً سفر رسول اللہ کا۔ آخر معراج میں کون گیا؟ میرے سرکار ہی تو تشریف لے گئے تھے مگر خدا کیا فرماتا ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا الخ

حضرات! یہ پندرہویں پارہ کی ابتدائی آیت ہے۔ آخر قرآن

ہی تو ہے۔ لہٰذا میں نے کیا بیجا کہا، یا کہاں مبالغہ سے کام لیا کہ قرآن بیان ادا ہے میرے مصطفٰے کا۔ اس سفر میں میرے سرکار اتنی بلندیوں پر گئے، جہاں جبرئیل کا ذہن نہ جا سکے، وہاں میرے مصطفٰے کا گزر جائے۔ پھر بھی اس صدی کا کٹھ ملّا۔ کہے کہ وہ میرے جیسے بشر؟ اس کی تفصیل تقریر معراج میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرات! اور آگے بڑھئے: ؎

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہے

بیعت رضوان:۔ آقائے کائنات جب صحابہ کی مختصر سی تعداد لے کر طواف کعبہ کے لئے تشریف لائے تو حضرت عثمان غنی کو بھیجا کہ وہ جا کر کفار مکہ کو اس سے مطلع کر دیں۔ چنانچہ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے گئے۔ اور ادھر ان کے بارے میں یہ خبر اڑا دی گئی کہ عثمان غنی کو معاذ اللہ شہید کر دیا گیا

یہ خبر سنتے ہی سید الکونین علیہ التحیۃ والتسلیم ایک درخت ببول کے سائے میں بیٹھ کر صحابہ کرام سے بیعت لینے لگے۔ اس طرح صحابہ کا ہاتھ نیچے ہوتا اور آقائے دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہاتھ اوپر۔ یہی وہ بیعت ہے جسے تاریخ اسلام بیعت رضوان کے نام سے یاد کرتی ہے۔ مجھے اس کی تفصیل میں جانا نہیں ہے بلکہ اپنے موضوع کے تحت یہ عرض کرنا ہے کہ آقائے دوعالم نے ایک ایک صحابی سے بیعت لی اور آخر میں اپنے بائیں ہاتھ کو اٹھا کر یہ فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اس ہاتھ کو اپنے داہنے ہاتھ پر رکھ کر عثمان غنی کی طرف سے بیعت لی۔ حالانکہ کفار مکہ نے یہ خبر پھیلا دی تھی کہ عثمان غنی کو شہید کر دیا گیا۔ اللہ کے رسول کے عالم غیب ہونے کی بیّن اور روشن دلیل ہے۔ اگر علم نبوت میں یہ بات نہ ہوتی کہ عثمان غنی زندہ

ہیں تو ان کی طرف سے بیعت کے کیا معنی؟ ایک لغو اور بے معنی سی بات کہی جاتی۔ مگر سرکار ان کی طرف سے بیعت لے کر بتانا چاہتے ہیں کہ عثمان غنی زندہ ہیں۔

چنانچہ اس بیعت سے متعلق، اگر صحابہ کرام سے دریافت کیا جاتا کہ طریقۂ بیعت کیا تھا، تو ہر صحابی یہی فرماتے کہ ہمارا ہاتھ نیچے اور سرکار کا ہاتھ اوپر مگر آداب قرآن کے پاس۔ قرآن کیا کہتا ہے اس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

اللہ اکبر! معارج ومراتب کی یہ بلندی، اور علوئے مرتبت کا یہ حال۔ آنکھ دیکھے رسول کا ہاتھ، اور خدا فرمائے یہ تو میرا ہاتھ ہے۔ اس وقت میرا موضوع یہی ہے کہ ہاتھ مصطفےٰ کا، بتانا خدا کا اور نام اسی کا قرآن ہے۔

حضرات! اب تو بہت سے لوگوں کی آنکھوں کے دبیز پردے ہٹ گئے ہوں گے۔ اور انھیں یہ یقین ہو چلا ہوگا کہ یقیناً قرآن مصطفےٰ کے بیان ادا ہی کا نام ہے۔

ایک نکتہ:۔ لیکن یہاں ایک نکتہ یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ نے رسول کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ فرمایا ہے حالانکہ وہ خدا کا ہاتھ نہیں ہے؟ وہ سبوح وقدوس جسم وجسمانیات سے پاک وصاف اور مبرا ومنزہ ہے۔ لہٰذا اس کے معنی بدلے جائیں گے مَا یَلِیْقُ بِشَانِہٖ یعنی وہ جو اس کی شان کے لائق ہے۔ یہ آیت متشابہات سے ہے اور آیت متشابہات کے لفظی معنی کا نہ تو تعین کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے معنی حقیقی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ اسکی مراد کو خدا ہی بہتر جانے۔ بس زیادہ سے زیادہ اس کی تعبیر میں یہی کہہ سکتے ہیں جو اس کی شان کے لائق ہے۔ مزید تفصیل وتشریح سے عقل انسانی عاجز

وقاصر ہے۔ مگر اس انداز بیان کو تو دیکھئے کہ خدا اپنے محبوب کے ہاتھ کو اپنا فرمائے اور سرکار اپنے ہاتھ کو عثمان غنی کا ہاتھ فرمائیں ؎

پہونچا کہاں سے ہے کہاں سلسلۂ دراز عشق

اس سے بارگاہ رسالت میں سیدنا عثمان غنی کی محبوبیت و مقبولیت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حضرات! میں نے یہی تو کہا تھا کہ ہاتھ رسول کا، بتلانے والے خدا، اور اسی کا نام قرآن ہے۔

اور آگے بڑھئے:۔

ایک ایسا مقام جہاں سرکار نے کافروں کی جانب اپنی مٹھی سے دھول اور کنکری پھینکی، ان میں ایک ایک سے دریافت کیجئے کہ کس نے پھینکا تو ہر دیکھنے والا یہی کہے گا کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پھینکا۔ لیکن اب قرآن کے قریب آئیے کہ خدا کیا کہتا ہے؟ فرماتا ہے:۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ اے مصطفےٰ جب تم نے پھینکا تو تم نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔

قرآن کے اس اندازِ بیان پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے کہ اقرار بھی ہے اور انکار بھی ہے۔ میرے پیارے! یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی تھی کہ تم نے نہیں پھینکا اللہ نے پھینکا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ تم نے نہیں پھینکا جب تم نے پھینکا۔ واہ واہ پھینکنے کا اقرار بھی ہے اور پھر اسی کا انکار بھی۔

حضرات! یہی ہے قرآن کا وہ انداز فصاحت و بلاغت جس کے سامنے عرب کے بڑے بڑے نامور اور شہرۂ آفاق شعراء و ادباء نے گھٹنے ٹیک دیئے اور قرآن کے ایک ایک آیت پر سجود نیاز لٹاتے ہیں۔ غور فرمائیے اگر اس آیت میں مثبت کی قید نہ لگائی جاتی بس اتنا ہی کہدیا جاتا کہ تم نے نہیں پھینکا اللہ نے پھینکا، تو اندازِ بیان میں اتنا وزن نہ پیدا ہوتا جتنا

اس میں ہے کہ تم نے نہیں پھینکا جب تم نے پھینکا۔

قرآن کا انداز بیان دیکھنے کے بعد جی یہ چاہتا ہے کہ ایک ایک نقطہ پر تاشہائے جگر کو قربان کر دیا جائے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قرآن کا ن کے پردے سے ٹکرا کر دلوں میں گھر بناتا چلا جاتا ہے۔

بہر حال کہنا یہی ہے کہ پھینکنا مصطفیٰ کا ، بتانا خدا کا ہے۔ نام اسی کا قرآن ہے۔

حضرات! اگر میں تفصیل میں آگیا تو اندیشہ ہے کہیں تمہید ہی خود مستقل ایک موضوع نہ بن جائے۔ بس ایک مثال اور دے کر سلسلۂ تمہید کو ختم کر کے اصل موضوع "سراج منیر" پر آجاؤں گا۔

آپ غور فرمائیں کہ سورۂ "والضحیٰ" کی شان نزول کیا ہے؟

حضرات! کافروں نے چند سوالات سرکار سے کئے تھے۔ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معمول گرامی یہ تھا یا تو فوراً برجستہ جواب عطا فرماتے۔ یا فرماتے انشاء اللہ تبارک وتعالیٰ جواب دوں گا۔ آج آپ نے انشاء اللہ نہ فرمایا۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ نزول وحی کا سلسلہ بند رہا۔ تین دن، گیارہ دن، ۱۵ دن، ۴۰ دن علیٰ اختلاف الروایت۔

اب اس درمیان میں کافروں نے جواب کا شدت سے مطالبہ شروع کیا۔ آخر الموں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چھوڑ دیا۔ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ناراض ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی آقائے دوعالم کا چہرہ اتر گیا جیسے ہی سرکار کا چہرہ اترا ویسے ہی رحمت باری جھومی۔ جبرئیل کو یہ حکم ہوا کہ جاؤ میرا پیغام میرے محبوب تک پہونچاؤ۔ چنانچہ حضرت جبرئیل امین سورہ والضحیٰ لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے۔

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔

یعنی نہ تو تمہارے رب نے تم کو چھوڑا اور نہ ہی تم سے ناراض ہوا۔
کافروں نے یہی تو کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا رب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ناراض ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی پر " ما ودعک " داخل فرما دیا یعنی نہ تو تمہارے خدا نے تم کو چھوڑا اور نہ ہی تم سے ناراض ہوا۔

ایک نکتہ:۔ حضرات! یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رب تبارک و تعالیٰ کو تو یہی کہنا تھا کہ تمہارے رب نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔ تو پھر سورہ کی ابتداء یعنی شروع ہونی چاہئے تھی " والضحیٰ والیل اذا سجیٰ " کیوں کہا گیا۔؟
حضرات! نزول قرآن میں مزاج انسانی کی بھرپور رعایت کی گئی ہے۔ آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک شہرۂ آفاق خطیب جب قوم کو خطاب کرتا ہے تو پہلے اصل مضمون نہیں بیان کرتا بلکہ اسکی تمہید اٹھاتا ہے تاکہ آنے والے مضمون کو قبول کرنے کے لئے ذہن سنجیدہ آمادہ و تیار ہو جائے۔ ایسے ہی اپنے وقت کا نامور ادیب و قلمکار جب کسی مضمون کو احاطۂ تحریر میں لانا چاہتا ہے تو پہلے اصل مضمون ہی کو نہیں لکھتا بلکہ اس کا دیباچہ سنوارتا ہے تاکہ مضمون اچھی طرح ذہن نشیں ہو سکے بس اسی طرح خدائے قدیر کو یہی فرمانا ہے کہ تمہارے رب نے نہ تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔ مگر " والضحیٰ والیل اذا سجیٰ " اصل مضمون کی بہت ہی اونچی اور بڑی پیاری تمہید ہے۔ گویا اصل مضمون سے پہلے خدا قسم یاد فرماتا ہے یعنی مصطفےٰ تمہارے رخ زیبا کی قسم اور زلف معنبر کی قسم یعنی اس رخ زیبا کی قسم جسے تم بے نقاب کر دو تو زمانہ روشن ہو جائے۔ اور اس زلف پیچاں کی قسم جسے تم بکھیر دو تو زمانہ تاریک ہو جائے، نہ تو تمہارے رب نے تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔ گویا

رات و دن دونوں تمہاری بارگاہ کے بھکاری ہیں، دن اپنی روشنی اور اجالے کے لئے تمہارے روئے تاباں کا محتاج ہا ور رات اپنی تاریکی وگیسو درازی میں تمہاری زلف پیچاں کی نیاز مند ہے۔

یہ تمہید اتنی پیاری اور اونچی ہے کہ اس کو سنتے ہی خود لوگوں کو یقین ہوگیا کہ جو خدا ان کے چہرے اور زلفوں کی قسم یاد فرمائے وہ بھلا ان کو چھوڑ کیسے سکتا ہے؟ اور ناراض کیونکر ہو سکتا ہے۔

اب پھر اصل موضوع سے وابستہ ہو جائیے۔ ہم اور آپ کہیں یہ سورۂ والضحیٰ ہے، لیکن سورۂ والضحیٰ سے پوچھئے کہ تو کیا ہے؟ تو اس کا کہنا ہے کہ میں تو مصطفےٰ کے اترے ہوئے چہرہ کی شادابی لانے والی ہوں، ان کے شکستہ خاطر پر مرہم رکھنے آئی ہوں، ان کے قلبِ حزیں پر طمانیت و سکون کا شبنم چھڑکنے آئی ہوں۔

حضرات! پتہ چل گیا، جسے دنیا کہے قرآن، اور وہی قرآن کہے میں تو بیانِ ادا ہوں محمد رسول اللہ کا۔ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک

سِرَاجًا مُّنِیْرًا

حضرات! میں نے عرض کیا کہ قرآن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کے بیان کا نام ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے، چہرہ رسول کا بتائے خدا اور نام اسی کا قرآن۔

حضرات! سراج کے معنی آفتاب اور چراغ، دونوں کے ہیں پروردگار اپنے محبوب کو چمکتا سورج اور روشن چراغ فرما رہا ہے۔ اب دیکھنا اور غور کرنا یہ ہے کہ آفتاب کی وہ کونسی خصوصیات ہیں جنہیں مصطفےٰ کے چہرے کو ان سے مماثلت و مشابہت ہے۔

(۱)

حضرات! جس طرح آسمان کا آفتاب طلوع ہوتا ہے تو وہ اونچ نیچ، امیر غریب، راجہ پرجا، حاکم محکوم، راعی و رعایا، آقا و غلام، چھوٹا بڑا، کالا گورا اور سفید و سیاہ کو اپنی روشنی دینے میں فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ وہ یکساں طور پر سب کو اپنی کمال فیاضی سے معمور و منور کرنا چاہتا ہے، وہ راجہ کے سر بفلک محل اور غریب کی پھوس کی شکستہ جھونپڑی میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچتا، اس کے مزاج و فطرت میں ہے کہ وہ یکساں طور پر سب کو اپنی ضیا بخشیوں سے مالا مال کرے۔

بس ایسے ہی میرے سرکار بھی آسمان نبوت کے آفتاب ہیں وہ اپنی ہدایت کی کرنوں کے بکھیرنے میں مکی، مدنی، ترکی، مصری، ہندی، سندھی، یونانی اور افغانی میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچتے۔ وہ یکساں طور پر ہر ایک کو آفتاب ہدایت سے روشنی و درخشندگی بخش رہے ہیں۔

(۲)

میرے سرکار! آفتاب بھی ہیں اور چراغ بھی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو آفتاب میں ہیں لیکن چراغ میں نہیں، کچھ خوبی چراغ میں ہے آفتاب میں نہیں، مگر میرے سرکار میں دونوں کی خصوصیات جمع ہیں۔

مثلاً آفتاب سے کوئی دوسرا آفتاب روشن نہیں ہو سکتا مگر ایک چراغ سے بے شمار چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔

(۳)

حضرات! اس کو سمجھنے کے لئے ایک ضابطے کو سمجھنا ضروری ہے۔ دیکھئے! شئی ایک ہوتی ہے مگر جگہ کے بدل جانے سے نام بدل جاتا ہے مثلاً ہم ساحل سمندر پر آئے اس کی اٹھتی موجوں کو، پھر اس کی بچھی ہوئی سفید اور طویل و عریض چادر کو دیکھا تو یہی کہا کہ یہ پانی ہے۔ لیکن سورج کی گرم

شعاعوں نے اتنی حرارت دگرمی پیدا کی کہ یہی پانی دھوئیں کی طرح ہواؤں میں اڑتا نظر آیا، جب ہم نے اسے اڑتے ہوئے دیکھا تو کہا یہ بھاپ ہے اور اسی بھاپ نے اوپر جاکر جب اپنی قرارگاہ بنالیا تو اب ہم نے بدلی کہا۔ پھر ہوائیں چلیں تو بدلیوں میں ٹکراؤ ہوا جس کے نتیجے میں ہلکی ہلکی بوندیں گریں ہم نے کہا دیکھو یہ ترشح ہو رہا ہے۔ رم جھم، رم جھم بارش ہو رہی ہے پھر اس میں شدت ہوئی تو ہم نے کہا موسلا دھار بارش ہو رہی ہے پھر یہی پانی سطح زمین پر بہنے لگا تو آپ نے کہا کہ یہ پانی ہے۔ چند نالیاں آپس میں مل گئیں تو آپ نے کہا کہ نالہ ہے۔ کچھ نالے یکے بعد دیگرے ایک دوسرے سے ملتے گئے تو آپ نے کہا کہ یہ ندی ہے، پھر ندیاں آپس میں ملتی گئیں تو آپ نے کہا کہ یہ دریائے گنگا و جمنا ہے۔ پھر یہی دریا آخر میں خلیج بنگال ہوتے ہوئے سمندر کی آغوش میں آگیا تو آپ نے اسے سمندر کہا

حضرات! پانی ایک ہے لیکن جگہ بدلتی جا رہی ہے۔ آپ نام بدلتے جا رہے ہیں اسی ایک پانی کو کبھی آپ نے بھاپ کہا، پھر اسے بدلی اور بادل کہا، پھر اسی کو ترشح اور موسلا دھار بارش کہا، پھر اسی کو نالی کہا، پھر اسی کو نالا کہا، پھر ندی کہا پھر اسے دریا کہا اور آخر میں پھر اسے سمندر کہا۔

بس ایسے ہی مرکز تو نور مصطفےٰ ہے مگر یہی روشنی ابوبکر کے پاس آئی تو پیکر صداقت کہا، اور وہی روشنی فاروق اعظم کو ملی تو پیکر عدالت کہا اور وہی روشنی عثمان غنی کو ملی تو پیکر سخاوت کہا، وہی روشنی علی مرتضیٰ کو ملی تو پیکر شجاعت کہا۔ بس ایسے ہی منتقل ہوتے ہوئے نہ جانے کتنے چراغ روشن کرتی گئی۔

اسی کو قرآن نے کہا ہے مصطفےٰ تم چمکتے سورج ہو اور روشن چراغ۔

(۴)

حضرات! آپ یہ سوچتے ہوں گے کہ روشنی تو ایک ہی ہے مگر یہ
الگ الگ جلوے کیسے؟ کوئی صدیق اکبر بن کر چمکا، کوئی فاروق ہو کر ابھرا
کوئی غنی ہو کر آسودہ ہوا، کوئی علی و شیر ہوا
حضرات! آپ دور نہ جائیے! ابھی ہنڈال میں دیکھئے یہ روشنی کی
جھالریں لٹک رہی ہیں اور یہ راڈ بھی لگے ہیں مگر کوئی سرخ ہے، کوئی سبز
کسی کا رنگ پیلا ہے، کسی کا اجلا، کسی کا نیلا تو سچ سچ بتلائیے کیا اسے پاور ہاؤس
سے الگ الگ رنگ کی روشنی مل رہی ہے۔؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔
یعنی مرکز ایک ہی طرح کی روشنی دے رہا ہے مگر شیشے کا رنگ بدلتا
جا رہا ہے تو روشنی بھی بدلتی جا رہی ہے۔
بس ایسے ہی مرکز نورِ مصطفیٰ ہے
وہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے روشنی نہیں بدلتی بلکہ دل کا فانوس بدلتا
جا رہا ہے جس کا جیسا دل تھا ویسی ہی روشنی بھی نمودار ہوئی کہیں صداقت
کی روشنی پھیلی، کہیں عدالت کی، کہیں سخاوت کی، کہیں شجاعت کی۔
اسی لئے قرآن میرے سرکار کو فرماتا ہے "سراجاً منیرا" یعنی مصطفیٰ تم
آفتاب بھی ہو اور روشن چراغ بھی۔
یہ وہ مثال ہے کہ ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہوتے
ہیں۔

(۵)

ایک سوال اور اس کا جواب: جب علمائے اہلسنت یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
نے سب سے پہلے میرے سرکار کو اپنے ہی نور سے پیدا فرمایا تو بعض عقل کے
اندھے اس پر استحالہ پیش کرتے ہوئے اعتراض کرتے ہیں کہ پھر تو اللہ
کے نور کا کوئی حصہ کوئی جزو کٹ کر علیحدہ ہو کر اس میں آیا ہوگا معاذ اللہ

حضرات دنیا وی مثال سے اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ جب ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کئے جاسکتے ہیں تو کیا ہر چراغ میں اول والے چراغ کا جز کٹ کر اس میں چلا آتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو سوچا ہی چراغوں کے جلنے کے بعد پہلے چراغ کو بالکل ختم ہو جانا چاہیئے۔ اگر ایک چراغ کو دوسرے چراغ سے سرسوں کے دانے سے بھی کم تر جز کٹ کر مل رہا ہو تو ہر دو چار سو چراغ تک پہنچتے پہنچتے پہلے کو ختم ہی ہو جانا چاہیئے مگر ایسا نہیں ہے۔ تیل بتی درست رکھیئے اور بے شمار چراغ پہلے چراغ سے روشن کیجئے۔ اس میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ یہ جوں کا توں علی حالہ باقی رہے گا۔

جب ایک مادی نور کا یہ حال ہے تو اس نور حقیقی و نور الٰہی کا کیا حال ہوگا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

(۹)

حضرات! ابھی گفتگو یہ چل رہی ہے کہ سرکار روشن چراغ ہیں اس سلسلے میں ایک تاریخی واقعہ یاد کیجئے۔

ایک بار آقائے دوجہاں کسی سفر میں ہیں صحابہ کرام بھی شریک سفر ہیں۔ اللہ کے رسول نے ایک ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں پانی کا کوئی چشمہ یا کنواں وغیرہ کچھ نہ تھا۔ اور اب قافلہ میں پانی بالکل ختم ہو چکا ہے صحابۂ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! اب ہمارے پاس پانی کی بوند تک نہیں۔ سرکار نے ارشاد فرمایا، ایسا کرو اس پہاڑی کو پھاند کر ادھر جاؤ۔ ایک کالا کلوٹا، حبشی غلام اونٹ پر پانی کا مشکیزہ لے کر جا رہا ہے۔ اسے میرے پاس بلا لاؤ۔ میں پانی کا نظم کر دوں۔

حکم پاتے ہی صحابہ آگے بڑھے دیکھا تو سچ مچ ایک حبشی غلام اونٹ پر پانی کا مشکیزہ لئے جا رہا ہے۔

نوٹ:۔ ایک لمحے کے لئے پھر رک جائیے۔ اگر صحابۂ کرام رضی اللہ

عنہم رسول اللہ کے لئے علم غیب کے قائل نہ تھے، تو انھیں سوال کرنا چاہیے تھا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنا بڑا پہاڑ نظروں کے سامنے حائل ہے آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ایک کالا کلوٹا غلام، اونٹ پر پانی کا مشکیزہ لئے جا رہا ہے، سوال نہ کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کا عقیدہ تھا، سرکار عالم غیب ہیں۔ پھر جانے والے کی کوئی دھندلی تصویر نہیں بلکہ اس تفصیل کے ساتھ کہ کالا کلوٹا حبشی غلام، اونٹ مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا۔ اللہ اکبر! گویا وہ آنکھوں کے سامنے کھڑا ہے۔ اور سرکار دیکھتے جا رہے ہیں اور بتاتے جا رہے ہیں۔

نکتہ:۔ رنگ کا دیکھنا کہ کالا کلوٹا ہے، اونٹ کا دیکھنا یہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ تو آنکھ والے کا کام ہے۔

بہر حال اتنا تو تم نے مانا کہ جہاں تم نہیں دیکھتے، وہاں سرکار دیکھتے ہیں۔ مگر یہ تو بتاؤ یہ معلوم کر لینا کہ یہ غلام ہے کیا یہ بھی آنکھ ہی کا کام ہے یہ کیسے پتہ چلا کہ یہ غلام ہے؟

شاید کہ تم یہ کہو یہ ان کا قیاس تھا۔ تو پھر مجھے کہہ لینے دو جن کا قیاس اتنا صحیح ہوتا ہو ان کے علم کی صحت ولیقین کا کیا حال ہوگا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

حضرات! پھر وہیں آجائیے! کہ صحابہ پہونچے دیکھا کالا کلوٹا حبشی غلام، اونٹ پر پانی کا مشکیزہ لئے جا رہا ہے۔ چنانچہ صحابہ نے عرض کیا میرے آقا نے تم کو بلایا ہے تم وہاں چلو۔ غلام نے جواب دیا، تمہارا آقا وہ ہے جس نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے اور میرا آقا وہ ہے جس نے مجھے پانی لانے کے لئے بھیجا ہے مگر جب صحابہ کرام نے سمجھانے کی طرح سمجھایا تو وہ غلام راضی ہو گیا اور آقائے کائنات کی بارگاہ میں حاضری

دی۔ سرکار نے فرمایا ہمارے قافلے کا پانی ختم ہو گیا ہے۔ زیادہ نہیں صرف ایک پیالہ پانی دیدو۔ چنانچہ اس نے ایک پیالہ پانی دیدیا۔ اب سرکار کا اعجاز یہاں سے رنگ لاتا ہے۔ پورے قافلے کو حکم دیدیا سیراب ہو جاؤ پورے قافلے نے پانی پیا، اونٹوں نے بھی پانی پیا، نہانے والے نہائے وضو کرنے والوں نے وضو کیا۔ غرض کہ جسے جس طرح استعمال کرنا تھا ویسے استعمال کیا اور یہ غلام سب دیکھتا جا رہا ہے کہ میں نے تو ایک ہی پیالہ پانی کا دیا تھا یہ سب کے سب کیسے سیراب ہو رہے ہیں؟۔

اچانک پیالہ کے قریب آیا تو کیا دیکھا کہ پیالہ جوں کا توں پانی سے بھرا ہوا ہے۔ گویا کہ اس سے ایک قطرہ نہیں لیا گیا ہے۔ یکایک غلام کو پیالے میں اپنی تصویر نظر آئی تو کیا دیکھا کہ چند لمحوں کی صحبت نے اسے گورا چٹا بنا دیا۔ اب دل کا دروازہ کھل گیا۔ اور عرض کیا کہ میں شرف بہ اسلام ہونا چاہتا ہوں۔ سرکار نے کلمہ پڑھا کر مسلمان بنا لیا۔ اور اب خود سرکار ہی نے ارشاد فرمایا تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ۔

یہ غلام عرض کرتا ہے سرکار! اب تو زندگی کا چین و سکون آپ کے قدموں میں ہے اپنے قدموں سے دور نہ کیجئے۔ اس نے ہر چند اصرار کیا مگر عالم غیب نبی نے اسے واپس کر دیا۔

چنانچہ اب وہ پانی کا مشکیزہ لے کر اپنے آقا کے دروازہ پر آگیا۔ آقا باہر آیا۔ اس نے پوچھا تم کون ہو؟ جواب دیا میں آپ کا غلام ہوں۔ آقا نے کہا ہرگز نہیں۔ تم میرے کیسے غلام ہو سکتے ہو۔ اس نے کہا اگر مجھے نہیں پہچانتے تو اونٹ ہی پہچان لیجئے، مشکیزہ پہچانئے اور یہ چابی کا چھلا پہچانئے۔

مالک نے پوچھا آخر یہ انقلاب کیسا؟ گئے تھے کالے کلوٹے

ہو کر۔ اور لوٹے ہو تو گورے چٹے ہو کر۔ غلام نے کہا، جب گیا تھا تو آپ کا غلام تھا اور اب لوٹا ہوں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہو کر آیا ہوں۔ آقائی بدل گئی تو رنگ و روپ بھی بدل گیا؟

یہ سنتے ہی مالک کے دل میں لپک پیدا ہوئی اور گویا ہوا مجھے بھی لے چلو۔ اس نے کہا اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے؟ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ انھیں کے قدموں میں بسیرا ڈال دیا جائے۔ اب دونوں چلے۔ آقا پیچھے ہونے لگا تو غلام نے کہا آپ آگے چلئے۔ کیونکہ میں غلام ہوں اور آپ آقا ہیں۔

مالک نے کہا تم غلام نہیں آقا ہو۔ جو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا غلام ہو جاتا ہے تو پھر وہ ہم جیسوں کا آقا ہو جاتا ہے۔

چنانچہ غلام آگے آگے اور مالک پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔ دوستو! یہ ہے سرکار کی غلامی۔

بہر حال اب یہ دونوں سرکار کی بارگاہ میں پہونچے۔ غلام کے آقا نے جیسے ہی سرکار کی موہنی صورت دیکھی، چہرے پر پیغمبرانہ جاہ و جلال اور رسالت و نبوت کا ہم دیکھا، مٹی ہو گیا اور قدموں میں بچھ گیا۔ عرض کیا مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ سرکار نے کلمہ پڑھایا، وہ مشرف بہ اسلام ہوا۔

نکتہ:- یہ حبشی سرکار کی بارگاہ میں ٹھہرنا چاہتا تھا مگر سرکار نے واپس کر دیا۔ اس کی مصلحتیں ملاحظہ فرمائیے:-

اگر سرکار اسے روک لیتے تو لوگ سیرت نبوی پر دھول اڑاتے اور یہ کہتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کے غلاموں کو کلمہ پڑھا کر اپنے پاس روک لیتے ہیں۔ اس سے سیرت مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر داغ دھبہ آنے کا اندیشہ تھا۔

(۸)

دوسری بات یہ تھی کہ میرے سرکار کو معلوم تھا کہ اگر یہ یہاں رہ گیا تو یہاں بہت سے چراغ ہیں۔ البتہ یہ جہاں جائے گا اس چراغ سے دوسرے چراغ بھی روشن ہوں گے۔ اس لئے سرکار نے اسے واپس کر دیا۔ قرآن نے ایسے ہی چہرے مہرے والے کو "سراجاً منیرا" کہا مصطفےٰ آپ چمکے "سورج ہو، روشن چراغ ہو۔

(۹)

حضرات! اس مثال سے بعد ایک گوشے اور سماعت فرمایئے:
جب مالک نے اپنے غلام سے کہا اب تم میرے آقا، میں تمہارا غلام "تم آگے چلو، میں پیچھے"۔
ایک بار میں تصوف کی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا تو ایک بات نظر سے گذری۔ اسے جی لگا کر سماعت فرمایئے۔
ایک صاحب دل درویش سڑک کے حاشیے پر کھڑے تھے اچانک ادھر سے کتوں کو گرفتار کرنے والی گاڑی گذری۔ کارپوریشن اور میونسپل بورڈ کی طرف سے کچھ ایسا انتظام رہتا ہے کہ جب شہر میں کتے زیادہ ہو جاتے ہیں تو کتوں کی گرفتاری عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس گاڑی کو کوئی پہچانے یا نہ پہچانے، مگر کتے بہت اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اس لئے شور مچاتے چلتے ہیں۔ شاید کہ وہ اپنی برادری کو اپنی آواز سے خبردار کرتے ہوں۔ بھاگو، کھسکو، گرفتاری آئی۔ مگر وہی کتے گرفتار کئے جاتے ہیں جس کے گلے میں پٹہ نہیں ہوتا۔
بہرحال: جب یہ گاڑی درویش کے قریب سے گذری تو ایک بال دار کتے نے اپنے گلے کو جھٹکا دیا تو اس سے اس کا پٹہ نظر آ گیا۔ پٹہ دیکھتے ہی گرفتار کرنے والے نے کہا ارے یہ تو کسی کا پالتو

معلوم ہوتا ہے۔ بس یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور اس کتے کو آزاد کر دیا۔ سڑک کے حاشیہ پر صاحب دل درویش جو کھڑے تھے ان پر کیفیت طاری ہو گئی۔ اور زمین پر گر پڑے۔ معتقدین نے اٹھایا اور جب وہ ہوش میں آئے تو لوگوں نے کہا کہ یہ کونسا ایسا جملہ تھا، جسے سن کر آپ کو حال آ گیا۔؟

فرمایا تمہارے جیسے سنگ دلوں کے لئے صرف ایک جملہ تھا مگر میرے لئے وہ تیر و نشتر تھا۔ فرمایا اس بالدار کتے کو، ان لوگوں نے یہ سمجھ کر گرفتار کر لیا تھا کہ آوارہ ہے، کسی کا پالتو نہیں ہے یعنی اس کا کوئی مالک نہیں ہے۔ مگر جب پٹہ لٹکا آیا تو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ ارے یہ تو کسی کا پالتو معلوم ہوتا ہے۔

بس میں نے بھی سوچا کہ اگر کل میدانِ قیامت میں ہمارے گلے میں سرکار دوجہاں کی غلامی کا پٹہ ہو گا تو فرشتے یہ کہہ کر رہا کر دیں گے ارے یہ تو شفیع محشر کا غلام معلوم ہوتا ہے۔

دوستو! ہم نے تم نے اس غلامی کی قدر و قیمت نہ جانا۔ آج جس نازک دور سے مسلمان گذر رہا ہے اگر وہ اس نکتہ کو سمجھ لے، تو ہر غم، ہر مصیبت، ہر بلا، ہر آفت سے رہائی پا جائے۔ رہائی کا راز مصطفیٰ کی غلامی میں مضمر و پوشیدہ ہے۔ اور صحیح معنوں میں اگر ہم اور آپ ان کے غلام ہو جائیں تو کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ مصیبتوں کے جو پہاڑ توڑے جا رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے بارے میں سمجھ لیا ہے کہ اب ہم برائے نام کے مسلمان رہ گئے ہیں کام کے نہیں رہے اسلامی روح نکل چکی ہے۔ کاش ہم صحیح معنوں میں ان کے غلام ہو جاتے

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

حضرات! اس واقعہ میں آپ نے یہ بھی سنا کہ غلام ایک پیالہ پانی دینے کے بعد جب رسول کردگار کے قریب آیا تو کیا دیکھا؟ اب کالا کلوٹا نہیں بالکل گورا چٹا ہو گیا ہے۔

معلوم ہوا میرے سرکار سراج منیر ہیں لیکن آسمان کے آفتاب اور آفتاب نبوت میں فرق یہ ہے کہ آسمان کا آفتاب صرف ظاہر اور اوپری سطح کو چمکاتا ہے اور آفتاب نبوت باطن کو بھی چمکاتا ہے۔ آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو زمین کی اوپری سطح چمک جاتی ہے، کھپریل کا ظاہر چمک اٹھے گا مگر باطن نہیں چمکے گا۔ مگر میرے سرکار ایسے آفتاب ہیں جو ظاہر و باطن دونوں کو چمکاتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے اسی حقیقت کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے تمنا کی ہے

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
مرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے

اسی لئے پروردگار عالم فرماتا ہے پیارے! تم چمکتے سورج اور روشن چراغ ہو۔

نکتہ:۔ حضرات! یہاں پر ایک نکتہ اور بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ سرکار ایسے آفتاب ہیں کہ ظاہر و باطن دونوں کو چمکاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلکیں ہیں نہ خانقاہیں ہوتیں یہ جو خانقاہیں ہیں اسی کا مظہر ہیں، کہ یہاں باطن کو چمکایا جاتا ہے۔

حضرات! میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ سرکار نے ظاہر و باطن دونوں کو چمکایا، مگر اب مجھے یہاں عرض کرنے دیجئے کہ باطن کو چمکانا اور ہے، اور باطن سے چمکانا اور ہے۔ اب تک تو آپ نے یہ سمجھا کہ باطن کو بھی چمکایا اب باطن سے چمکانا ملاحظہ فرمائیے:۔

جلال الدین اکبر کا دور تھا۔ ایک روز وہ اپنے کمرے میں آیا

اتفاقاً شمعیں سب بجھ گئیں۔ کمرے کی تاریکی برداشت نہ کر سکا، دل گھبرایا، الجھن بڑھی، چہرے پر ایک رنگ آیا ایک رنگ گیا، حتی کہ دل کی گھبراہٹ تیز سے تیز تر ہوگئی۔ مصاحبین سب اکٹھے ہوگئے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ دل کمرے کی تاریکی برداشت نہ کر سکا۔ فوراً قبر یاد آئی سوچا جب اس کمرے کی تاریکی برداشت نہ کر سکا جس میں اٹھنا بیٹھنا، لیٹنا اور سوتا ہوں اس سے دل بھی مانوس ہے مگر اس قبر کی تاریکی کا کیا عالم ہوگا جہاں نہ کوئی مونس نہ غمخوار نہ چراغ نہ دیا، گھٹا ٹوپ تاریکی اس لئے اختلاج ہوا۔ لوگ سمجھاتے رہے جواب دیتے رہے مگر کسی طرح دل کو تسلی نہ ہوئی، اتفاق سے بیربل آگیا اس نے بھی یہی سوال کیا بادشاہ نے وہی جواب دیا جو سب کو دے چکا تھا۔

بیربل نے عرض کیا، بادشاہ سلامت! ایک بات ارشاد فرمائیں آپ جس پیغمبر پر ایمان لائے ہیں ان کا آفتاب نبوت اس روئے زمین پر کتنے برسوں چمکا اور روشن رہا۔؟

اکبر نے جواب دیا۔ ۲۳ برس، ۱۳ برس مکی زندگی اور ۱۰ برس مدنی زندگی۔ بیربل نے کہا جب آپ کے نبی کا آفتاب نبوت صرف ۲۳ برس زمین کے اوپر چمکا اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نور اور روشنی سے پوری دنیا چمک اٹھی، زمین کے گوشے گوشے میں اس کی روشنی پھیل گئی۔ اور اب تو وہ آفتاب نبوت کئی صدی سے زمین کے نیچے آرام فرما رہا ہے تو کیا زمین کے نچلے طبقے کو نہ چمکا رہا ہوگا۔

اسے حضور! قبر کی تاریکی سے وہ ڈرے جس کے ہاتھ میں ان کا دامن نہ تھا ما ہو۔ آپ کیوں ڈر گئے۔ جب کہ آپ کے ہاتھ میں اسی آفتاب نبوت کا دامن ہے ؎

برین نازم کہ ہستم امت تو — لگا ہے یا رسول اللہ لگا ہے

ایسے ہی چہرے مہرے والے کو خدا فرماتا ہے وداعیًا الی اللّٰہ باذنہ وسراجًا منیرًا۔ مصطفےٰ تم چمکتے سورج ہو اور روشن چراغ۔ ؎

تم چودھویں کے چاند ہو تم آفتاب ہو
جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو

نکتہ (۹) :- حضرات! شاید کسی کو شبہ پیدا ہو کہ اب تو وہ نہ رہے پھر روشنی پھیلانے کا کیا سوال؟

لہٰذا یہ نوٹ کر لیجئے کہ آج آپ کو یہی سننا ہے اور میرا موضوع بھی یہی ہے کہ آسمان آفتاب سے آفتاب نبوت کو کتنی وجوہ سے مشابہت و مماثلت ہے۔ چنانچہ اس میں ایک یہ بھی ہے کہ آسمان کا آفتاب غروب ہونے کے بعد معدوم و مٹ نہیں جاتا بلکہ چھپ جاتا ہے۔ اسی لئے سرکار اعلیٰ حضرت امام اہلسنت فرماتے ہیں: ؎

تو زندہ ہے واللہ، تو زندہ ہے واللہ
میرے چشم عالم سے چھپ جانے والے

اسی لئے خدائے ذوالجلال نے "سراجًا منیرًا" فرمایا۔ اے مصطفےٰ تم چمکتے سورج اور روشن چراغ ہو۔

(۱۰)

حضرات! آفتاب سے مماثلت کی وجہ سماعت فرمائیے! آفتاب جب ڈوب رہا ہو تو اس وقت اسے دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ آسمان کے حاشیے پر سونے یا پیتل کی تھالی چمک رہی ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو آفتاب بظاہر دیکھنے میں پیتل کی تھالی معلوم ہو رہا ہے اس کے بارے میں فلاسفر کا کہنا ہے کہ وہ پورے کرۂ ارض اور روئے زمین

سے سوا تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔

حضرات! یہ سورج پہلے آسمان کا ستیارہ نہیں بلکہ چوتھے آسمان کا سیارہ ہے اس لئے آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ زمین سے پہلے آسمان کی بلندی، پھر پہلے آسمان کی موٹائی اور اس کا حجم، پھر ایسے ہی پہلے آسمان سے دوسرے، دوسرے سے پھر تیسرے، پھر چوتھے آسمان کی دوری و موٹائی اندازہ لگائیں کہاں یہ زمین کہاں چوتھا آسمان جسے دیکھ کر تو آنکھ نے کہا کہ پیتل کی تھالی۔ مگر فلاسفہ نے کہا روئے زمین سے سوا تیرہ لاکھ گنا بڑا سمجھ میں آگیا کہ جس طرح یہ آسمان کا آفتاب دیکھنے میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے مگر کرۂ ارض کو آفتاب سے کوئی نسبت نہیں۔

بس ایسے ہی مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آسمان نبوت کے آفتاب ہیں دیکھنے میں بظاہر بشر معلوم ہوتے ہیں مگر پورے عالم بشر کو آفتاب نبوت سے کوئی نسبت نہیں۔ اسی لئے خدا فرماتا ہے مصطفےٰ ان چمکتے سورج اور روشن چراغ ہو۔

(۱۱)

حضرات! آفتاب سے ایک مناسبت اور بھی ملاحظہ فرمائیے، ابھی میں نے عرض کیا کہ جب آفتاب ڈوب رہا ہو تو اسے دیکھئے ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے پیتل کی تھالی، مگر یہ بتائیے کہ ٹھیک بارہ بجے دوپہر میں بھی، آپ آفتاب سے آنکھیں ملا سکتے ہیں۔۔؟ آنکھیں خیرہ اور چکاچوند ہو جائیں گی۔

معلوم ہوا جب آسمانی آفتاب بالکل سر پر ہو تو کوئی اس سے آنکھ ملا کر دیکھ نہیں سکتا بس ایسے ہی میرے سرکار آسمان نبوت کے آفتاب ہیں۔ آفتاب کی طرح اگر وہ بے نقاب ہو جائیں تو پھر انھیں کون دیکھ سکتا ہے؟ اور پھر اس صورت میں مبعوث ہونے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لئے خدا نے آفتاب نبوت کو لباس بشر میں بھیجا، تاکہ دنیا والے قریب

آکر فائدہ اٹھا سکے۔ اور ہدایت پا سکے۔ اسی لئے خدائے قدیر سراج منیر فرماتا ہے۔ مصطفےٰ تم چمکتے سورج اور روشن چراغ ہو۔

کہیں دور نہ جائیے، خاندان نبوت ہی سے اس کی مثال دیئے دیتا ہوں۔ حضرات! سیدنا امام علی رضا رضی اللہ تعالےٰ عنہ، ساتویں پشت کے شاہزادے ہیں۔ جب ان کے روئے زیبا کی زیارت نہیں کرسکتے تو بھلا کہیں میرے مصطفےٰ بے نقاب آجاتے تو کسی کی آنکھ ان کا جلوہ دیکھ سکتی؟

(۱۲)

حضرات! آفتاب سے ایک مناسبت اور ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے کبھی اس کا تجربہ کیا ہوگا کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اگر آپ آفتاب کے سامنے منہ کرکے چلیں تو آپ کا سایہ پیچھے نظر آتا ہے پیچھے چلتا ہے گویا اس میں اشارہ مل رہا ہے کہ اگر تم آفتاب نبوت کی طرف بڑھوگے تو دنیا سایہ کی طرح تمہارے پیچھے پیچھے دوڑے گی۔ اور اگر کہیں تم نے آفتاب نبوت سے منہ موڑا تو دنیا کی تلاش میں تم پیچھے پیچھے دوڑوگے۔ اور یہ دنیا تم سے آگے آگے بھاگے گی۔ اگر اس دنیا کو مسخر کرنا چاہتے ہو تو ان کی طرف چلو۔ یہی وہ وجوہ ہیں کہ خدا اپنے محبوب کو سراج منیر فرماتا ہے، مصطفےٰ تم چمکتے سورج اور روشن چراغ ہو۔

(۱۳)

حضرات! آپ سوچتے ہوں گے کہ جب سرکار آفتاب بن کر آئے تھے تو ابوجہل وابولہب کیوں نہ چمکے۔؟

حضرات! آفتاب کا کام تو چمکانا ہے مگر کوئی چمکنا بھی تو چاہے۔ مثلاً بہت عرصہ ہوا میں نے پڑھا تھا کہ امریکہ میں سوسو منزل کی عمارت ہے اب آپ کسی کو اسی سو منزل والی عمارت کی آخری منزل کے کمرے میں لے جائیے۔ اور اس وقت ٹھیک بارہ بجے کی دوپہر ہو مگر وہ شخص کمرے میں جاکر دروازہ بند کرلے۔ تمام کھڑکیوں کو بند کرکے کالے پردے لٹکادے روزن وسوراخ کو کپڑے سے بند کردے تاکہ کسی طرف سے بھی روشنی آنے

کی گنجائش نہ رہ جائے اور ہر لمحہ یہ بات ہے پورا امریکہ چمک رہا ہوگا، ذرہ ذرہ گلی گلی، کوچہ کوچہ روشن مگر اس کمرے میں تاریکی ویسی ہی ہوگی۔ اب اگر وہ شخص اپنی بدنصیبی کا ماتم کرے، یا آفتاب کا شکوہ کرے کہ دیکھو پورا امریکہ روشن ہے مگر میرا ہی کمرہ تاریک ہے۔ دنیا اس کی گوشمالی کرے گی نادان! تیری عقل پر پتھر پڑا ہے۔ ارے آفتاب کی کرنیں تو میرے کمرے کی دہلیز پر سر پٹک رہی ہیں، اندر آنے کو وہ مچل رہی ہیں تو دروازہ کھول دے۔

بس ایسے ہی آفتاب نبوت کی ضیا باری و ضیا پاشی تو عام ہے مگر ابوجہل و ابولہب نے دل کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ یہی وہ مناسبت ہے جس سے قرآن سراج منیر کہہ رہا ہے۔ مصطفٰے تم چمکتے سورج اور روشن چراغ ہو۔

اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَن یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا

(۲۲ پارہ ۶ رکوع)

ترجمہ!

جس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کی اس نے بڑی کامیابی پائی۔

سائلو دامن سخی کا تھام لو

کچھ نہ کچھ انعام ہو ہی جائے گا

یادِ ابرو کر کے تڑپو بلبلو

ٹکڑے ٹکڑے دام ہو ہی جائے گا

مفلسو! اُن کی گلی میں جا پڑو

باغِ خلد اکرام ہو ہی جائے گا

(اعلیحضرت)

حضرات! سیرتِ نبوی کے چند گوشے آج میری تقریر کا عنوان ہیں جن میں خصوصیت سے اطاعتِ رسول، درجِ امتیاز، اور قانون کی جامعیت پر مجھے روشنی ڈالنا ہے۔ یہ ایک ایسا مبسوط و مفصل مضمون ہے جس کے لئے ہزار ہا صفحات اور کئی راتیں درکار ہیں۔ اور اس کے بعد بھی یہ عنوان تشنۂ تکمیل ہی تصور کیا جائے گا۔

حضرات! آج کا دور ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے۔ دنیا کے سائنسی ممالک جنھوں نے نت نئی ایجادات اور قوتِ عمل کی نوع بنوع شاہکاروں سے اپنے کو حیرت کدۂ عالم بنا رکھا ہے۔ یقیناً اس سائنٹفک دور میں انھیں حق ہے کہ وہ اپنے بلند بانگ نعروں سے دنیا کو مخاطب کر کے اپنی فکری برتری کا اعلان کریں۔ اور ہمیں بھی کسی حد تک اس کے اعتراف میں کوئی تامل و تکلف نہیں۔

واضح رہے کہ اس اعتراف کے باوجود ہم کسی احساسِ کمتری میں بھی مبتلا نہیں ہیں۔ چونکہ ہم ایک ایسے مذہب کے پیروکار اور ایسے ہادی و ریفارمر کے منقاد و مطیع اور اطاعت شعار امتی اور غلام ہیں جو مادیات سے زیادہ روحانیت کے عروج و ارتقاء پر زور دیتا ہے۔ اور اسی قانون کے زریں فارمولے اور اس کے ذیلی دفعات نہ تو کاغذی صفحات تک محدود رہے اور نہ ہی طاقِ نسیاں کی نذر ہو کر رہ گئے۔ بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے والے ہر صدی اور ہر دور میں آفتاب و ماہتاب کی طرح صدرِ مجلس بن کر رہے۔ اور ان کے روشن و تابناک نقوشِ قدم کو ہر دور میں مشعلِ راہ تصور کیا گیا۔

حضرات! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج کا دور ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے، لیکن اس ترقی یافتہ دور میں کسی ملک اور صوبے سے نہیں بلکہ

پوری دنیا سے بس صرف ایک سوال کیجیے کہ اسے آسمان پر محل اٹھانے کا خواب دیکھنے والو! ہم تم سے دس پانچ نہیں بلکہ دنیا کی پوری آبادی سے صرف ایک ایسا انسان چاہتے ہیں، جو بیک وقت دنیا کو یہ کہہ کر بلا رہا ہو کہ اے لوگو! تم مفکر بننا چاہتے ہو تو میرے قریب آؤ، مفسر و محدث بننا چاہتے ہو تو میرے قریب آؤ، منطقی و فلسفی بننا چاہتے ہو تو میرے قریب آؤ، بلند پایہ خطیب اور ادیب شہیر بننا چاہتے ہو تو میرے قریب آؤ۔ قاضی و مفتی اور سپہ سالار بننا چاہتے ہو تو میرے پاس آؤ۔ کمانڈر بننا چاہتے ہو تو میرے پاس آؤ۔ کامیاب تاجر و سوداگر بننا چاہتے ہو تو میرے پاس آؤ۔ عابد شب زندہ دار بننا چاہتے ہو تو میرے پاس آؤ تو آج اس سوال کے سامنے ساری دنیا گھٹنے ٹیک دے گی اور نیک نیتی اور عاجزی سے اپنی تہی دامنی کا اعتراف کرتے ہوئے اسے کہنا پڑے گا کہ آج ہم میں کوئی انسان ایسا نہیں جو دنیا کے ہر انسان کا دامن مراد و طلب کے مطابق گوہر مقصود سے بھر سکے لیکن دنیا کی بھری آبادی میں اگر کوئی قوم اپنی پیشانی بلند کر کے چل سکتی ہے تو وہ قوم مسلم ہے۔

آج ہم دنیا سے کہہ سکتے ہیں کہ اے لوگو! تم میں کوئی انسان کامل نہیں لیکن اگر سچ مچ دل کی تڑپ اور قلب کی گہرائیوں سے تمہیں کسی ایسے رہبر کامل کی تلاش ہے تو کہیں اور نہ جاؤ مصطفٰے کی بارگاہ کرم میں آجاؤ۔ یہ صدیق اکبر، فاروق اعظم، ذوالنورین، حیدر کرار، ابو ہریرہ ابو عبیدہ بن الجراح، عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ بن زبیر، یہ سب کے سب اسی درسگاہ علم و حکمت کے خوشہ چیں ہیں۔ تاریخ عالم کی پیشانی پر جن کا نام آج بھی سنہرے حرفوں سے لکھا ہوا ہے۔ حوادثاتِ روزگار اور گردشِ لیل و نہار نے کتنی تاریخ ساز شخصیتوں کے کارناموں پر بیا

پردے ڈال دیئے ہیں مگر درس گاہِ نبوت سے یہ وہ فیض یافتہ جماعت ہے جن کی زندگی کے نقوش کو تاریخ نے ہمیشہ کے لئے اپنے کلیجے سے لگا رکھا ہے۔ یہ تاریخ نہ تو خانہ ساز تھی اور نہ ہی یہ جواہرات ایسی نیش سے کہ تدریجاً ان کی روشنی مدہم پڑ جاتی بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اس کا اجالا اور بڑھتا جا رہا ہے۔ اور آج کا انسان کلمہ نہ پڑھنے کے باوجود ہادئ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نیز ان کی زندگی سے قریب تر آتا جا رہا ہے۔ یہ تو ہماری کم نصیبی ہے کہ کلمہ گو ہو کر ہم ان کی زندگی سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ آج یورپ کی نقالی میں ہمیں مزہ آتا ہے، ہم پیچھے مڑ کر کبھی اپنے تابناک ماضی کا سویرا اور اجالا دیکھنا نہیں چاہتے اے لوگو! یہ تباہی و بربادی خود نہیں آئی ہماری لائی ہوئی ہے۔ خود اسے ہم نے اپنا گھر اور دروازہ دکھلایا ہے۔ کچھ تو نشیب ہے جہاں پانی مر رہا ہے۔

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج کی تمام قوموں میں اگر کوئی اپنا سر اونچا کر سکتی ہے تو وہ قوم مسلم ہے۔ اسی کی تجوری میں زندگی کا ایسا گراں مایہ سرمایہ ہے جس سے دنیا کی تمام تجوریاں خالی ہیں۔

آج کی مضطرب و بے چین آبادی کو امن و شانتی کا بھرپور اور باور پیغام اگر کہیں مل سکتا ہے تو اسلام ہی کے دامن میں مل سکتا ہے اسلام جو ہادئ عالم اور محسنِ انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ مکی و مدنی زندگی کا خلاصہ و نچوڑ ہے۔ جس پیغمبر اسلام کے پاکیزہ اخلاق اور زندگی کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کان خلقہ القرآن فرمایا۔ گویا قرآن پیغمبر نے پڑھ کر سنایا، اور قرآن بن کر دکھایا۔

حضرات! ایسے ہادی کے لئے خدا فرماتا ہے۔ اے مصطفیٰ! تم

حضرات! نہ جانے میں کن کانٹوں میں الجھ گیا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ سرکار معلم ہیں آج تھوڑے سے وقت میں ان کی معلمانہ زندگی کا ایک سرسری جائزہ پیش کر رہا ہوں۔

حضرات! میرے سرکار ایسے معلم ہیں کہ جہاں دیکھو وہیں معلم، ایک چبوترے پر دیکھو وہاں معلم۔ یہ وہ درس گاہ ہے کہ جن کے طلبہ کو اصحاب صفہ کہا جاتا ہے سیدنا ابو بکر، سیدنا فاروق اعظم، سیدنا عمار، سیدنا علی مرتضی سیدنا زید بن ثابت، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم یہ سب اسی درسگاہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کا نصاب سو پچاس کتابوں پر مشتمل نہیں تھا بس ایک معلم اور ایک کتاب۔ معلم سرکار ہیں اور کتاب قرآن۔ جو بھی جوان اس درس گاہ میں داخلہ لیتا وہ پوچھتا کیا پڑھنا ہوگا۔ قرآن جس کا کوئی سہ ماہی و ششماہی امتحان متعین نہیں تھا۔ معلم پڑھاتا اور پلاتا جارہا ہے تشنگانِ علوم سیراب ہوتے جارہے ہیں۔

ان کا کوئی سالانہ امتحان بھی متعین نہیں تھا۔ ان کی امتحان گاہ اللہ کا گھر ہے۔ امتحان معاشرے میں معاملات کا رکھ رکھاؤ یا ان کی عیالی زندگی یہی کانٹے تھے جس پر ان کی زندگی تولی جاتی تھی، یہی وہ کسوٹی تھی جس پہ کھرے کھوٹے کو جانچا پرکھا جاتا تھا۔

حضرات! ہم نے سرکار کو ایک چبوترے پر دیکھا تو معلم پایا اب اور آگے بڑھئے:

ایک بار آقائے کائنات نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ ایک سوکھے درخت کی ٹہنی کو جنبش دیا۔ سرکار کے جنبش دینے سے درخت کی پتیاں جھڑنے لگیں۔ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا "دیکھ رہے ہو کیا ہو رہا ہے۔ صحابہ نے

عرض کیا، یارسول اللہ! آپ کے جنبش دینے سے درخت کی پتیاں جھڑ رہی ہیں تو اس جواب کے بعد سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سنو! جس طرح میرے جنبش دینے سے درخت کی پتیاں جھڑ رہی ہیں۔ ایسے ہی جب مسلمان وضو کرتا ہے تو اس کے پانی سے اس کے گناہ جھڑ جاتے ہیں ہم نے آبادی سے باہر دیکھا تو معلم پایا۔

نکتہ:- ایک بار سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ کے زمانے میں کسی نے اس حدیث سے متعلق یہ سوال کیا، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وضو کے پانی سے گناہ کس طرح جھڑ جاتے ہیں تو آپ اسے اپنے ہمراہ مسجد لے گئے اور اس پر ایک توجہ خصوصی فرمائی جس سے آنکھوں کے کچھ حجابات ہٹ گئے۔ اسی اثناء میں ایک شخص آیا اس نے وضو کرنا شروع کیا امام محترم نے فرمایا، یہ دیکھو کہ اس کے اعضائے وضو سے جو پانی گر رہا ہے وہ کیسا لگتا ہے۔

چنانچہ اس نے غور سے دیکھا، اور یہ کہا کہ اس کا پانی کیچڑ کے مانند معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرے کے بارے میں فرمایا اب اسے دیکھو، اس کا پانی کیسا لگتا ہے اسے دیکھ کر اس نے کہا اس کا پانی مٹیالے رنگ کا ہے جیسے پانی میں مٹی ملا دی گئی ہو۔ اب تیسرے نے وضو کرنا شروع کیا آپ نے فرمایا اسے دیکھو! اسے دیکھ کر اس نے کہا اس کا پانی بالکل صاف وشفاف معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے ان تینوں کو اپنے پاس بلایا جس نے پہلے وضو کیا تھا اس سے دریافت فرمایا تم نے کون سا گناہ کیا ہے؟ یہ سنتے ہی بدن پر رعشہ طاری ہوا اور ہونٹوں پر کپکپی۔ سوچا یہ کوئی اور نہیں پوچھ رہا ہے اس دور کا امام، اور اللہ کا ولی پوچھ رہا ہے۔ میں اس سے

اپنے جرم پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ سہمی آواز میں بولا حضور مجھ سے "زنا کا گناہ" صادر ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا چونکہ یہ گناہِ کبیرہ تھا اس لئے اس کا گناہ کیچڑ کی شکل میں ٹپک رہا تھا۔ پھر دوسرے کو بلا کر پوچھا اب تم بتاؤ کہ کون سا گناہ کیا ہے۔ وہ بھی امام کے علمی رعب و جلال سے واقف تھا اس نے عرض کیا کہ مجھ سے جھوٹ کا گناہ، صادر ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جھوٹ زنا سے کم درجہ کا گناہ ہے، لہٰذا یہ مٹیلے رنگ میں بہ رہا تھا۔

پھر آپ نے تیسرے کو بلا کر دریافت فرمایا کہ اب تم بتاؤ، کہ کون سا نیک کام کرتے ہو؟

خود فرمائیے، یہاں انداز سوال بدل گیا۔ اب یہ سوال نہیں ہے، کہ کون سا گناہ کرتے ہو بلکہ یہ سوال ہے کہ کون سا نیک کام کرتے ہو؟ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گیا، سوچا کہ آج راز کھل گیا۔ جواب دیا حضور! میرے پاس اس کے سوا اور کوئی نیکی نہیں کہ ایک نماز ادا کر کے دوسری نماز کا انتظار کرتا ہوں۔ فرمایا چونکہ گناہ ہی نہیں تھا اس لئے اس کے بہنے اور ٹپکنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

حضرات! یہاں پہنچ کر یہ بات خود روشن ہو گئی کہ تمام نگاہیں اسے نہیں دیکھ پاتیں جسے نگاہِ نبوت دیکھا کرتی ہے۔

یہاں پہنچ کر ایک اور بات یاد آ گئی، ایک بار ایک اعرابی بدو صحرا نشیں ایک ریگستان سے گذر رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے بے چین و بے قرار تھا۔ کوسوں دور کہیں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسی حال میں ایک انگریز کا گذر ہوا۔ اسے ترس آیا۔ اس نے پوچھا اے بدو! کیا تجھے پانی چاہیئے۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ اس نے مشکیزے سے ایک برتن میں پانی نکال کر بدو کی طرف بڑھایا۔ اور ایک دوربین اسے

دی اور کہا کہ پینے سے پہلے دوربین سے پانی کو دیکھ لو جب اس نے اس پانی کو دیکھا تو بہت ہی چھوٹے چھوٹے کیڑے نظر آئے۔ جو بغیر دوربین کے نظر نہیں آسکتے تھے۔ یہ دیکھتے ہی وہ برجستہ کہنے لگا الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ، یاحبیب اللہ، یانبی اللہ۔

انگریز نے حیرت زدہ ہوکر دریافت کیا کہ بہت تعجب کی بات ہے۔ پانی میں نے دیا، دوربین میں نے دی، میرے احسانات کا شکریہ تو تم نے مجھ سے منہ بھی ادا نہ کیا۔ اور اپنے ہی نبی پر درود وسلام بھیج رہے ہو۔

اعرابی نے جواب دیا: جب تم نے پانی دیا تو مجھے اب سرکار کی ایک بات یاد آگئی۔ میرے غیب داں نبی نے بہت پہلے فرمایا تھا کہ مسلمان ہر پانی پر بھروسہ نہ کرے بعض پانی ایسے بھی ہوتے ہیں اس میں اتنے ہی باریک اور چھوٹے کیڑے ہوتے ہیں۔ جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے۔ تو آج دوربین نے اس کی تصدیق کر دی۔ میں نے محسوس کیا کہ جسے عام نگاہ نہیں دیکھ پاتی۔ اسے نگاہ نبوت دیکھا کرتی ہے۔ اب تم خود بتاؤ اس دوربین کا احسان مانا جائے یا غیب داں نبی کا شکریہ ادا کیا جائے بے شمار درود وسلام میرے نبی پر۔

گفتگو یہ چل رہی ہے کہ جہاں دیکھو میرے سرکار معلم ہیں۔

حضرات! ایک بار آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابیہ کے گھر تشریف لائے یہ ان کا کرم تھا کہ اپنے غلاموں کو اس طرح نوازتے دل جیتنے کی بھی وہ ادا تھی کہ کائنات ان کی مٹھی میں سمٹی چلی آرہی تھی۔ صحابیہ نے چولھے پر ہانڈی چڑھا رکھی تھی۔ مالک کونین نے دریافت فرمایا ہانڈی میں کیا پکا رہی ہو۔ کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم اس میں گوشت اُبل رہا ہے۔ سید الکونین نے فرمایا کیا اس میں میرا بھی حصہ ہے

صحابیہ نے عرض کیا، یارسول اللہ یہ تو صدقے کا گوشت ہے۔ اسے آپ نے اپنے اوپر حرام فرمایا ہے اسے میں کس طرح آپ کو کھلا سکتی ہوں؟ سرکار نے فرمایا لَكِ صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَّةٌ یہ تمہارے لئے صدقہ تھے مگر میرے لئے ہدیہ ہوگا۔ جب تم نے لیا تھا تو صدقہ تھا مگر اب مالک ہونے کے بعد تم مجھے دوگی تو یہ صدقہ نہیں بلکہ ہدیہ ہے —
ہم نے ایک صحابیہ کے گھر سرکار کو دیکھا تو معلم پایا۔

نکتہ: - حضرات! ایک بہت ہی لطیف بات سماعت فرمائیں سرکار نے اپنے اور آل رسول پر صدقہ حرام فرمایا۔ اس کا ایک فلسفہ یہ بھی ہے جسے میں اکثر بیان کرتا رہتا ہوں کہ اس طرح کی رقم کا نکالنا دنیا کے دوسرے مذاہب میں بھی ہے، جسے وہ "دچھنا" کہتے ہیں۔ مگر ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

دیکھئے غور فرمائیے، ایک برہمن بھی مندر کے پجاری سے کہتا ہے کہ "دچھنا دو" پن کرو۔ لیکن وہ اس رقم کو لینے کے لئے خود اپنے دامن کو پھیلا دیتا ہے۔ مگر قربان جائیے، میرے سرکار پر، دنیا نے اسلام کو خیرات، زکوٰۃ، صدقات کی تعلیم فرمائی۔ لیکن یہ حکم دے کر ہمیشہ کے لئے اپنا دامن سمیٹ لیا۔ اور اپنا ہی نہیں، آل محمد کا دروازہ بھی بند کر دیا کہ یہ کھوٹا مال اس دروازے تک نہ پہنچے۔ تاکہ کل دنیا یہ نہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ و صدقات کا مسئلہ اس لئے اپنی قوم کو بتایا تاکہ اسی بہانے سے ان کی اور ان کے گھرانے کی پرورش ہو سکے

درود و سلام اس نبی پر جس نے قانون دے کر قانون کا بھرم رکھ لیا۔
حضرات! گفتگو ابھی یہی چل رہی تھی کہ جہاں دیکھو سرکار معلم ہیں ایک بار آقائے کائنات تشریف فرما ہیں اور ادب آشنا

صحابۂ کرام ارد گرد بیٹھے ہوئے جمالِ نبوت کا نظارہ کر رہے ہیں ۔ اسی اثناء میں صحابہ پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اپنے حال سے بے خبر ہو گئے ۔ اور اتفاقاً سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نشست چھوڑ دی ۔ سب سے پہلے جو خبردار ہوئے وہ سیدنا ابوہریرہ ہیں ۔ دیکھا ساقی موجود مگر آقا نہیں ۔ یکایک اٹھ کھڑے ہوئے خیال آیا کوئی شر پسند کہیں کوئی گزند نہ پہنچائے ۔ سرکار کی تلاش میں نکل پڑے ۔ اور تلاش کرتے کرتے ایک باغ تک پہنچ گئے ۔ اور وہیں رک گئے ۔

واقعہ کی تفصیل جاننے سے پہلے یہاں پر ایک نکتہ سماعت فرمائیں :-

نکتہ :- یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکار کی تلاش میں حضرت ابوہریرہ باغ تک کیوں نکل گئے ، جہاں مل سکتے تھے وہاں جانا چاہئے تھا ۔ حضرت عائشہ سے دریافت کرتے ، کاشانۂ فاطمہ پر جاتے وہاں پتہ لگاتے ۔ یہ باغ تک جانے کے کیا معنی ؟

حضرات ! راز یہ ہے کہ دریافت اسے کیا جاتا ہے جو اپنی رہ گزر پر اپنے گزرنے کی کوئی نشانی نہیں چھوڑتا ۔ ہم کو اور آپ کو پوچھا جائے گا ۔ زید و بکر کو دریافت کیا جائے گا ۔ لیکن اس عالمِ آب و گل میں ایک ایسا بشر بھی ہے جو کسی راہ سے گزرتا ہے ، اپنی علامت و نشانی چھوڑتا جاتا ہے ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی !

گلی پسینے کی خوشبو سے مہکتی جا رہی ہے ۔ جب وہ خوشبو خو

ہی غمازی کر رہی ہے اور پتہ بتا رہی ہے تو ابو ہریرہ کے ڈھونڈنے اور پوچھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

چنانچہ جہاں تک خوشبو ملی بڑھتے گئے، اور جب خوشبو نہ ملی قدم رک گئے۔ حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ باغ میں جب اندر جانے کا کوئی دروازہ نہ مل سکا تو وہ پرنالہ جس سے باغ کے اندر پانی جاتا تھا اسی راہ سے اپنے کو سکوڑ کر ابو ہریرہ باغ میں داخل ہوگئے جیسے ہی داخل ہوئے، جیسے ہی باغ میں پہونچے محسن اعظم، معلم انسانیت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کی زیارت سے مشرف ہوئے، دیکھا کہ آقائے کائنات جلوہ افروز ہیں۔ سلام عرض کیا، آنکھیں قدم بوس ہوئیں۔

اب جب کہ محبوب کا پتہ لگ گیا تو ساتھیوں کا خیال آیا۔ عرض کیا، یا رسول اللہ جیسے میں بے چین ہو کر آپ کی تلاش میں لگ گیا ویسے ہی دوسرے صحابہ بھی پریشان ہوں گے۔ اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ میں انھیں مطلع کردوں۔

ایک لطیف اشارہ :- یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابو ہریرہ جب چلے تھے تو اسی وقت ان میں سے کسی کو لے لیتے۔ اب وہ کیوں یاد آئے۔

حضرات! اس نکتے کو اہل محبت ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ جسے توفیق نہ دے۔ انسان کے بس کا کام نہیں ؎

اللہ جسے توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام تو ہے، عرفان محبت عام نہیں

محترم حضرات! یہ بات غیرت عشق کے خلاف ہے کہ محبوب کی

تلاش میں مناظقی کو ڈھونڈا جائے اسے غیرت محبت نے گوارہ نہیں کیا جو ابوہریرہ کا قدم اٹھ رہا تھا وہ محبت کا قدم تھا۔ اب جب منزل مل گئی تب ساتھی یاد آئے۔

بہرحال ابوہریرہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر حکم ہو تو میں ساتھیوں کو باخبر کر دوں؟ سرکار نے فرمایا، میرے پاس آکر کچھ لئے بغیر جانا چاہتے ہو؟

ابوہریرہ سمجھ گئے یا تو وحی اتری ہے، قرآن ملے گا یا حدیث مبارک، سرکار نے فرمایا یا اباھریرۃ من قال لا الٰہ الا اللہ فدخل الجنۃ اے ابوہریرہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوا۔

اب حدیث کو گرہ بنا کر جب ابوہریرہ چلنے لگے تو سرکار نے فرمایا ایسے نہ جاؤ میری نعلین (جوتا مبارک) اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ چنانچہ نعلین مبارک کو سر کا تاج بنالیا اور چلے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعلِ پاکِ حضور
تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں

جیسے ہی کچھ اور آگے بڑھے سب سے پہلے فاروق اعظم سے ملاقات ہوئی۔ سلام کے بعد حضرت فاروق اعظم نے آگے بڑھنا چاہا۔ حضرت ابوہریرہ نے عرض کیا "پریشان نہ ہوں، میں نے پتہ لگا لیا ہے حضور فلاں باغ میں تشریف فرما ہیں، مگر فاروق اعظم کو بن دیکھے چین کہاں؟ آگے بڑھنا چاہا۔ ابوہریرہ نے عرض کیا میں سرکار کی بارگاہ سے آرہا ہوں، کیا کچھ لئے بغیر آپ جانا چاہتے ہیں؟ حضرت فاروقِ اعظم کھڑے ہو گئے۔ ابوہریرہ نے عرض کیا آقائے دوعالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

اذهب بنعلیّ هاتین فمن لقیت من وراء هذا الحائط یشهد ان لا اله الا الله مستیقنا بها قلبه فبشره بالجنۃ۔ (مشکوٰۃ شریف کتاب الایمان ص۱ بحوالہ مسلم شریف)

ترجمہ۔ میری دونوں نعلین کو لیجاؤ اس دیوار کے پیچھے جو تم سے اس حال میں ملے کہ یقین قلب کے ساتھ لا الہ الا اللہ پر گواہی دیتا ہو تو اسکو جنت کی بشارت دیدو۔

یہ سنتے ہی غصہ میں فاروق اعظم کا چہرہ تمتما اٹھا حتیٰ کہ زور سے دھکا دیا جس سے ابوہریرہ زمین پر گر پڑے۔ ابوہریرہ نے کہا اے عمر میں آپ کو اللہ کے رسول کی حدیث سنا رہا ہوں اور آپ میرے ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں؟

فاروق اعظم نے فرمایا

چلو ہم دونوں ساتھ ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوں۔ اور خود حضور ہی سے استفسار کیا جائے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات باغ میں پہونچے۔ آقائے کائنات سے سلام عرض کرنے کے بعد فاروق اعظم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ابوہریرہ ایسا کہہ رہے ہیں، کیا سرکار نے ارشاد فرمایا ہے۔؟

یہ سن کر سرکار دوعالم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں اے عمر میں نے یہ کہا ہے۔ اب فاروق اعظم کے سامنے ابوہریرہ نہیں ہیں بلکہ پیغمبر خدا ہیں۔ آنکھیں جھک گئیں۔ بس دبی زبان سے اتنا عرض کیا یا رسول اللہ! کہیں لوگوں میں عمل کی طرف سے تساہلی نہ پیدا ہو جائے۔

سوال:۔ لیکن اب کلمہ پڑھا دیتیم بغلیں بجاتی ہو گی کہ مشتاق نظامی سے اچھا نسخہ مل گیا۔ اب کلمہ میں محمد رسول اللہ کہنے کی ضرورت نہیں بس لا الٰہ الا اللہ پڑھا دینا کافی ہے۔

جوابـ :۔ حضرات! محدثین کرام اس کا بہت ہی معقول اور سنجیدہ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جناب! اس سوال کا جواب خود اس حدیث میں موجود ہے۔ یعنی جب سرکار نے حدیث عطا فرمائی۔ اور ابوہریرہ حدیث لے کر چلنے لگے تو سرکار نے یہ بھی فرمایا تھا کہ صرف حدیث لے کر نہ جاؤ، میری نعلین مبارک بھی ساتھ لیے جاؤ۔ یہی اس سوال کا جواب ہے۔

اس میں اشارہ کرنا تھا کہ لا الہ الا اللہ اس وقت کہنا کافی ہوگا جب ابوہریرہ کی طرح میری جوتیاں اس کے سر کا تاج ہوں۔ سر پر نعلین مبارک کا رکھنا خود اس بات کی دلیل ہے، اگر نبی و رسول کو نہ مانتا تو ان کی جوتیاں اپنے سر پر کیوں رکھتا؟

علاوہ ازیں بہت ہی لطیف اور پتے کی بات یہ بھی ہے کہ اگر کوئی یہ کہتا ہو کہ کلمہ میں صرف لا الہ الا اللہ پڑھنا کافی ہے تو اس سے دریافت کیجئے، کہ یہ بات تم کو کہاں ملی؟ تو یقیناً وہ یہی جواب دے گا کہ حدیث سے۔ لہٰذا اب آپ دوسرا سوال کیجئے کہ حدیث کہتے کسے ہیں تو یقیناً وہ یہی کہے گا "قول رسول" کو یعنی جو رسول اللہ نے فرمایا وہ حدیث ہے۔

بس معلوم ہوا کہ کسی بات کو حدیث کہنے سے پہلے اس کے قائل کو نبی و رسول ماننا ضروری ہے۔ اگر ان کو نبی و رسول نہ مانو گے تو اسے حدیث کہہ ہی نہیں سکتے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اس کو حدیث کہنے سے پہلے سرکار کو نبی و رسول مان لے۔ ورنہ اسے حدیث کہا نہیں جا سکتا۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جز بول کر کل مراد لیتے ہیں

مثلاً ایک پیر نے اپنے مرید سے کہا سونے سے قبل "قل ھو اللہ" پڑھ لیا کرو، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بس قل ھو اللہ ہی پڑھے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ پوری سورۂ اخلاص پڑھے۔ قل ھو اللہ احد سے لے کر کفواً احد تک۔

ایسے ہی کسی نے کسی سے یہ کہا ارے بھئی بسم اللہ پڑھ لو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بس خالی بسم اللہ پڑھے بلکہ رحیم، تک پڑھو آپ نے کہا میں نے الحمد شریف پڑھ لی اس کے معنی یہ نہیں، کہ خالی الحمد پڑھ لیا۔ بلکہ الحمد سے لے کر ولا الضالین تک پڑھ لیا۔

ایسے ہی جس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھا اس سے مراد پورا کلمہ پڑھ لیا۔

ابھی میں نے کہا تھا کہ حدیث "قول رسول" کو کہتے ہیں اس سلسلہ میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حدیث کی تین قسمیں ہیں:

(۱) حدیث قولی۔ (۲) حدیث فعلی حدیث تقریری۔ اب ان سبھوں کی تعریف ذہن نشین فرمالیں۔

حدیث قولی وہ ہے جسے رسول نے زبان مبارک سے ارشاد فرمایا ہو۔

حدیث فعلی:۔ وہ ہے جسے رسول اللہ نے کرکے امت کو سکھایا اور بتایا ہو۔

حدیث تقریری:۔ وہ ہے کہ کسی صحابی نے سرکار کے پاس کوئی بات کہی یا کوئی کام کیا ہو۔ اس پر سرکار نے ان کو منع نہ فرمایا ہو تو وہ حدیث ہی ہے۔

مگر حدیث تقریری یعنی پیغمبر خدا کے سامنے کسی صحابی کا کچھ کہنا یا کچھ کرنا، اس پر سرکار کا نہ روکنا اس کی صحت کی دلیل ہے۔ لہٰذا

اس کی بھی نسبت بالواسطہ نبی ہی کی طرف کی جائے گی۔

حضرات! ابھی تک تو سرکار کی معلمانہ زندگی ہی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ غرض کہ ہم نے صحرا دیکھا تو معلم دیکھا، ایک صحابیہ کے کاشانہ پر دیکھا تو معلم پایا۔ باغ و باغیچے میں دیکھا تو معلم دیکھا، صحن کعبہ اور مسجد نبوی میں دیکھا تو معلم دیکھا۔ قربان جائیے ان کی اس عظمت و برتری پر۔

وقت کے ابھرے ہوئے سوال کا جواب

:- بہت سے حقیقت ناآشنا، متعصب اور ناداں سوال کرتے ہیں کہ مسلمان جنگجو ہے اور اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ اور ہمارا کہنا یہ ہے کہ تلوار سے نہیں بلکہ اخلاق محمدی سے پھیلا ہے۔

حضرات! آہنی تلوار سے سر قلم کیا جاتا ہے لیکن اخلاق کی تلوار سے دلوں کی دنیا فتح کی جاتی ہے۔ مصطفےٰ کے ہاتھوں میں لوہے کی تلوار نہیں، بلکہ دلوں کی دنیا مسخر کرنے والی اخلاق کی تلوار تھی جس کے سامنے آہنی تلوار کی دھار کند ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سیدنا عمر قبول اسلام سے پہلے چراغ نبوت کو گل کرنے ہی کے ارادے سے تو تلوار لے کر پہنچے تھے لیکن ابھی سیدنا عمر کی تلوار جنبش میں بھی نہ آئی تھی کہ اخلاق نبوت کی تلوار آگے بڑھ کر اپنا کام کر گئی۔ اور وہ تلوار جو پیغمبر کا خون چوسنے اور پینے کی غرض سے نیام سے باہر آچکی تھی وہ شرمسار ہو کر نیام کے اندر چلی گئی۔

دوستو! میں یہ ایک ذیلی بات کہہ گیا۔ کہنا یہ ہے کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ آپ اس سلسلے میں اسلام کا سب سے پہلا غزوہ ملاحظہ فرمائیں اور وہ ہے غزوۂ بدر۔ آپ تاریخ کا مطالعہ کر کے اس سے دریافت کیجئے کہ یہ جنگ کہاں ہوئی تھی تب آپ کو معلوم ہوگا کہ مدینہ سے قریب۔

حضرات! اس جنگ کا مدینے سے قریب ہونا خود اس کی دلیل ہے کہ کفار مکہ مدینے پر چڑھائی کی غرض سے آئے تھے، خون خرابہ، قتل و غارت گری

اور لوٹ مار کے ارادے سے نکلے تھے کسی کا سہاگ لوٹنے اور بچوں کو یتیم بنانے کی نیت سے آئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس جنگ کو مدینہ سے نہیں مکہ کے قریب ہونا چاہئے تھا۔ تب یہی الزام لشکر اسلام پر آتا اور ایسا نہیں ہے۔

لہٰذا اب آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ تلوار چلانا جرم ہے چلتی تلوار روکنا جرم نہیں ہے۔ کسی کے نشیمن میں آگ لگانا جرم ہے اس پہ پانی کا چھڑکاؤ جرم نہیں ہے۔ کسی ظالم و جابر کے مقابل اس کی مدافعت یہ تو ایک جمہوری و دستوری حق ہے جس پر نہ کبھی بندش لگائی گئی اور نہ کبھی پہرہ بٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر غزوۂ بدر میں تلوار چلی تو یہ قصور ان کا ہے جو مکہ سے سینکڑوں میل چل کر مدینہ پہنچے تھے۔

حیرت ہے! خطا کس کی اور الزام کس کے سر؟

لہٰذا! معلوم ہوا کہ مسلمان جنگ جو اور لڑاکا نہیں بلکہ وہ ایک جارح کے مقابل صرف اپنی مدافعت کرتا ہے۔ لہٰذا پہل ان کی ہے ہماری نہیں کسی کی پہل کے بعد اپنا دفاع کرنے والے کو جارح نہیں کہتے۔

اور یہ کہنا کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، یہ بھی سراسر غلط اور بہتان ہے۔ اس سلسلہ میں سرکار کا پیغمبرانہ مزاج ملاحظہ فرمائیں:

سرکار صحابہ کو ہدایت فرماتے ہیں کہ وضو میں اتنا ہی پانی خرچ کیا جائے، جس قدر پانی کی ضرورت ہو۔ ورنہ خدا کے یہاں اس کی ایک ایک بوند کا محاسبہ ہوگا حتیٰ کہ الفاظ حدیث یہاں تک ہیں ولو کان علی شط نہر جار یعنی اگرچہ دریا اور بہتی ندی کے کنارے ہی کیوں نہ وضو کرتے رہو۔

حضرات! یہاں پہنچ کر میں آپ کی توجہ کا طلب گار ہوں کہ اللہ کا ایک مخلص و پرہیزگار بندہ، اللہ کے حضور میں جانے کے لئے وضو

کر رہا ہے تو اتنے نیک کام اور نماز جیسی اہم عبادت کی ادائیگی میں اتنی سخت بندش لگا دی جا رہی ہے کہ آخرت میں قطرے قطرے کا حساب دینا ہوگا تو پھر مجھے کہنے دیجئے کہ جس پیغمبر کی نگاہ میں بہتے ہوئے دریا کے پانی کے ایک ایک قطرے کی اتنی قیمت ہو، تو آپ ہی بتائیں کہ پھر اس کی نظر میں انسانی خون کی کتنی قیمت ہوگی؟

بھلا وہ کب برداشت کر سکتا ہے کہ زمین پر خون ناحق گرایا جائے

اے اللہ کے بندو! خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لو۔

حضرات! اس فرمان نبوی سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس نبی کی نگاہ میں پانی اتنا قیمتی ہو، اس کی نظر میں انسانی خون کا احترام کتنا اور کس قدر ہوگا۔؟

یہیں پر میں اس نکتہ کا اظہار بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ اسلام کی جنگ کافر سے نہیں کفر سے ہے۔ گویا ایک نظریہ کا ایک نظریہ سے، ایک فارمولے کا ایک فارمولے سے، ایک آئین و دستور کا دوسرے آئین و دستور سے جنگ ہے۔ ؎

گویا ظلمت نور سے متصادم ہے
جہل، علم کے مقابلے میں
صف آرا ہے اور باطل نے حق کو دعوتِ رزم دیا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لا زوال ہے
شرکت میانہٗ حق و باطل نہ کر قبول
(اقبال)

حسین اعظم

حضرات! میں ایک ایسی نادر روزگار اور عظیم المرتبت شخصیت کا نام لینے جا رہا ہوں جس کا نام سننے کے لئے تڑپتے دل اور اشکبار آنکھوں کی ضرورت ہے جسے چرخ کہن نے کبھی علی مرتضٰے کے کاندھے پر دیکھا کبھی حضرت فاطمہ زہرا کی گود میں۔ جسے کائنات نے کبھی نانا کی کملی میں دیکھا کبھی تیغ و تبر و سنان، نیزوں اور انیوں کے درمیان تلواروں کے سائے میں، برچھیوں کی نوک پر جس نے اپنا سب کچھ لٹا کر ناموس مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثنا کو بچایا ہو اور وقار اسلام کو عزت بخشی ہو جو مر کر امر ہو گیا، اور جس کے خون کو کربلا کی ریت نے جذب نہیں کر لیا۔ بلکہ وہ آج بھی اسلام و مسلمان کے چہروں پر غازہ و سرخی کا کام کر رہا ہے۔ وہ ہے میرا اور سب کا حسین اعظم اب کلیجہ تھامئے اور ایک ایسا مسافر جو امیر کارواں تھا اس کی داستان غم سنئے۔

مجھ کو سنو جو گوش حقیقت نیوش ہو\
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِی اصْطَفٰی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ۔ بَلْ اَحْیَاۗءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝

وَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّمَ

(۱)

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ ۝

(۲)

وَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاۗءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ۔

(۳)

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

مثل اهل بیتی کسفینۃ نوح من رکبہا نجٰی ومن تخلف عنہا غرق ۔

(۴)

وقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم:

انا مدینۃ العلم وعلی بابہا ۔

حضرات! میری تقریر کا عنوان ہے حسین اعظم۔ اس عنوان سے متعلق میں نے حسب معمول قرآن مقدس کی ایک آیت مبارکہ کی تلاوت کی ہے۔ اور سید الکونین روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی چار احادیث مبارکہ کو اسی عنوان سے منسلک کیا۔ میں سب سے پہلے تلاوت کی ہوئی آیت مبارکہ کا مفہوم عرض کروں گا پھر احادیث مبارکہ کی تشریح۔ اس کے بعد آیت کی تشریح اور توضیح۔

حضرات! جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے سب سے پہلے آپ اس کا مفہوم سماعت فرمائیں۔ خدا کا ارشاد ہے:

اے ایمان والو! تم لوگ مدد چاہو، مدد طلب کرو صبر اور نماز سے۔ بیشک اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے! اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے انھیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور تمہیں شعور بھی نہیں۔

حضرات! یہ ہے اس آیت کا مفہوم جس کی میں نے تلاوت کی ہے۔ اس کی تشریح بعد میں کی جائے گی۔ اب ان احادیث مبارکہ کا مفہوم سماعت فرمائیں جسے میں نے اپنے موضوع کی مناسبت سے منتخب کیا ہے:۔

۱:۔ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: میرے

صحابہ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ستارے۔ ان میں تم جن کی اقتدار و پیروی کروگے ہدایت ہی ہدایت پاؤگے۔

گویا صحابۂ کرام آسمان کے ستاروں جیسے ہیں ان میں تم جس کے بھی دامن کرم سے وابستہ ہو جاؤگے ہدایت رسیدہ اور نجات یافتہ ہو جاؤگے۔

۲:۔ اور سرکار اہل بیت اطہار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح جیسی ہے یعنی جس طرح جو لوگ کشتی نوح میں بیٹھے وہ سلامت رہے اور پہونچ گئے۔ اور جو لوگ اس میں نہ بیٹھے وہ غرقاب ہوئے ڈوب گئے۔ اسی طرح میرے اہل بیت کی مثال ہے جو ان سے لگا رہے گا ان کے نقش قدم پر چلے گا وہ دین دنیا کے آلام و مصائب، عذاب و عتاب سے بچ جائے گا۔ اور جو ان سے کترا گیا اس کے لئے خسران اور گھاٹے کے سوا کچھ نہیں۔

گویا جو کہ ہدایت و نجات کا متمنی ہے وہ صحابۂ کرام اور اہل بیت اطہار دونوں کی عقیدت و محبت سے اپنے دل کو معمور رکھے اور ان لوگوں کی رضا کو اپنی رضا سمجھے اور اس میں دین و دنیا کی صلاح و فلاح یقین کرے تاریخی واقعات کی روشنی میں اگر کہیں ذہنی خلجان پیدا ہوتا ہو تو اس کو دفع کرتا رہے۔

حضرات! ان کے نقش قدم کو نشان راہ بنائیے اس طرح کا اعتدال اگر کہیں مل سکتا ہے تو وہ صرف مذہب اہلسنت ہے۔ جس میں صحابۂ کرام اور اہل بیت اطہار دونوں کی عقیدت و محبت کو جزو ایمان سمجھا جاتا ہے۔

دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے
ہاتھ اپنے دونوں نکلے کام کے

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاتھ میں دامن صحابہ بھی ہے، اور دامان اہل بیت بھی۔ ہم صحابۂ کرام اور اہل بیت اطہار کی عقیدت میں

ہوائے نفس یا تاریخی چمک کے قائل نہیں۔ خواہ وہ جنگ جمل ہو یا جنگ صفین حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ کی رائے کا اختلاف ہو، یا حضرت امام حسن یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا اختلاف ہو اور ان کی مصلحت بینی نہ تو ہم ان حضرات کے حکم ہیں اور نہ ثالث۔ اور سچ پوچھو تو یہ ہمارا منصب بھی نہیں ہے۔ آخر یہ سر کا کیسا سودا ہے کہ سارے اختلافات یہیں حل کر لئے جائیں۔ ایسے حوادثات و معاملات جہاں عقیدت کی آہنی دیوار میں شگاف آنے کا اندیشہ ہو، احادیث مبارکہ کو حکم و ثالث ماننے کی بجائے ترازو لے کر ہم کیوں بیٹھ جائیں جب اللہ کے رسول کی حدیث سے پتہ چل گیا کہ ہمارے لئے دونوں ہی واجب الاحترام اور قابل تقلید و پیروی ہیں، تو تاریخی گرداب و بھنور میں پاؤں ڈالنے کے بجائے خود سرکار کی حدیث اور فرمان نبوی کو کیوں نہ کسوٹی قرار دیا جائے اس لئے ہم اہلسنت "اصحابی کالنجوم" اور "مثل اہل بیتی کسفینۃ نوح" کے ہوتے ہوئے اگر تاریخی روایات کو پس پشت نہ ڈالیں تو کم از کم سکوت و خاموشی اختیار کیجئے۔

احادیث مبارکہ کی صراحت کے بالمقابل ایسی جرأت و جسارت جس سے ان میں سے کسی کے بھی دامن کے چھوٹ جانے کا خطرہ ہو وہاں ایک ایسی درمیانی راہ اختیار کرنی چاہئے جس سے نہ تو کسی جانب افراط کا الزام آئے اور نہ ہی تفریط کا۔

یہی وہ طریقہ ہے جسے اہل سنت و جماعت نے محمود و پسندیدہ قرار دیا ہے

حضرات! جب بات آہی گئی ہے تو مناسب ہے کہ اس کا آخری فیصلہ کر ہی لیا جائے۔ دیکھئے جب کسی مقدمہ میں منصف یا جج کے روبرو مدعی اور مدعا علیہ کے وکیل بحث کرتے ہیں تو مدعی سے نیچا اس کا محرر اور

منشی ہے اور وکیل سے اونچا منصف اور جج ہے۔ دیانتداری سے بتلائیے
دونوں وکلاء کی گفتگو سننے کے بعد فیصلے کا حق محرر کو ہے یا جج کو۔؟
یقیناً آپ یہی فرمائیں گے کہ یہ حق وکیل سے بڑے کو ملتا ہے چھوٹے
کو نہیں۔ بس ایسے ہی حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، اور
حضرت شیر خدا علی مرتضےٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ، حضرت سیدنا امام حسن مجتبےٰ
اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا وغیرہ کے جو اجتہادی اختلافات
ہیں ان میں ان کے بعد والوں یا ان سے درجہ درجات میں کمتر ہوں انھیں
کوئی حق نہیں کہ وہ فیصلے کی ترازو لے کر بیٹھ جائیں اور جسے چاہیں جیل کی
سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیں، یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیں۔
اولاً تو احادیث کے ہوتے ہوئے ہم کسی اور کے فیصلہ کے محتاج
ہی نہیں۔ ثانیاً اگر تاریخ حدیث کے مزاحم ہوجائے تو تاریخی روایات کی
ہم مناسب تاویل کریں گے جس سے مرتبۂ حدیث کو آنچ نہ پہونچے۔ اور
اگر تاویل کی گنجائش نہ نکل سکی تو ہم تاریخی روایات پر بہر حال احادیث کو
ترجیح دیں گے۔ اور فیصلہ اللہ اور اللہ کے رسول کے سپرد کر دیں گے
وہ احکم الحاکمین ہے اور اس کے نائب مطلق اور خلیفۂ اعظم سید الکونین
سلطان دارین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہیں۔

حضرات! ایک ذیلی بحث میں ہم نے شاید کہ آپ کا کچھ زائد وقت
لے لیا مگر یہ گفتگو میرے موضوع کی اہم کڑی تھی۔ اس لئے اسے نظر انداز
کر دینا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ ایک بہت ہی اہم اور تفصیلی بحث ہے لیکن
اختصار کے پیش نظر میں نے بہت ہی سمیٹ کر اسے پیش کیا ہے۔

نکتہ:۔ حضرات! ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکار نے صحابہ کو ستارہ

فرمایا اور اہل بیت اطہار کو کشتی نوح۔ آخر اس کا فلسفہ کیا ہے؟ اب میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔

دوستو! یہ اس نبی کا کلام ہے جس نے خود اپنے متعلق فرمایا" انا جامع الکلم"، میں کلمات کا جامع ہوں۔ یہ تو نبی ہی کی شان ہے کہ اشارات وکنایات میں ایسا فرمادیں کہ ہزاروں صفحات رنگنے کے بعد بھی ایک قلمکار ادائیگی مفہوم میں اتنا کامیاب نہ ہوسکے جتنا کہ نبی مرف ایک حرف میں بے شمار معنی پیدا کر دے۔ یہ تو اپنے اپنے غور وفکر کا معیار اور فہم ودرائے پر موقوف ہے کہ جس کی جیسی پرواز تھی وہ وہاں تک پہونچ گیا۔

واضح رہے کہ نبی کا ایک ایک حرف بہت ہی جچا تلا ہوتا ہے کسی بھی ادائیگی مفہوم میں الفاظ بہت ہی محتاط ہوتے ہیں

لہٰذا ایسے ہی ستارہ اور کشتی نوح میں ایک ایسی مناسبت ہے جو مشاہدے کی روشنی میں عقلاء اور دانشوروں کے مسلمات میں سے ہے۔

حضرات! آج کا بھی یہ دستور ومعمول ہے کہ رات کی تاریکی میں جہاز کا سمت سفر معلوم کرنے کے لئے جہاز کے کپتان کو آسمان کے ستاروں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ ان میں سے بعض ستارے سمت سفر متعین کرتے ہیں معاون ومددگار ہیں۔ اگر ان سے آنکھیں پھیری جائیں تو اندیشہ ہے کہ جہاز کا سمت سفر بدل جائے۔ نیز یہ بھی خطرہ ہے کہ راہ کے بدل جانے سے جہاز کسی ایسی پہاڑی سے ٹکرا جائے جو وسط سمندر پر ابھری نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو جہاز پاش پاش اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

لہٰذا یہ بات واضح ہو گئی کہ جہاز کے کپتان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ستاروں کی طرف سے غافل نہ ہوں ورنہ اس کے خطرات و

بُرے نتائج ظاہر ہوں گے۔ بس اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ ایسے ہی سرکار نے صحابہ کو ستارہ اور اہل بیت کو کشتی فرما کر اشارہ کر دیا کہ کشتی کے سوار اور خود ملّاح کے لئے ضروری ہے کہ وہ ستاروں سے غافل نہ ہوں۔ اگر کشتی سوار ستاروں سے غافل ہو گئے تو سمت سفر کے بدل جانے کا اندیشہ یقینی ہے۔ جانا کہیں ہوگا اور پہنچے گا کہیں۔

اس لئے اگر اس ساحل سے اس ساحل تک جانا ہے تو کشتی کی بھی ضرورت ہے اور ستاروں کی بھی۔ ایک بحری جہاز کو منزل سے ہمکنار ہونے کے لئے ضروری ہے کہ کشتی سے بھی تعلق رکھے اور اس کی نگاہ ستاروں پر بھی ہو۔ غرض ان دو لفظوں میں سرکار نے ایک ایسی معتدل اور نارمل صورت پیدا کر دی ہے کہ اگر اسے منظور کر لیا جائے تو نہ جانے کتنے پیچیدہ مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

نکتہ:۔ حضرات! اب یہیں پر ایک بات اور بھی ملاحظہ فرمائیں کہ صحابہ کی مثال ستاروں جیسی ہے اور اہل بیت نبوت کی مثال کشتی جیسی۔ تو آپ مجھے ایک بات بتائیں کہ ایک شخص کسی کشتی سے اس ساحل سے اس ساحل تک جانا چاہتا ہے مگر وہ ایسا مسافر ہے کہ ساحل پر کھڑے ہو کر محض کشتی کی تعریف کرتا ہے اس کا بڑھئی بہت عمدہ ہے، پلے اور تختے بھی بہت مضبوط ہیں، سائز بہت مناسب ہے لشتنگا ہیں بہت اچھی بنی ہیں، اور رنگ و روغن بھی بہت دل کش ہے نقش و نگار بھی اچھے بنے ہیں۔ چپو اور پتوار بہت مضبوط ہیں، ملاح بھی چست و چالاک اور ہشیار ہے۔ دن بھر تعریف کرتا رہا، ہفتہ بھر تعریف کرتا رہا، مہینہ بھر تعریف کرتا رہا، برسوں تعریف کی۔ اب سچ سچ مجھے بتلائیے یہ ساحل پر کھڑے رہ کر کشتی کی تعریف کرنے والا زندگی بھر تعریف کرتا رہا لیکن

کشتی کے قریب نہ آیا، نہ اس پر بیٹھا تو کیا محض تعریف کرتے کرتے دوسرے ساحل تک پہونچ جائیگا۔ یقیناً آپ فرمائیں گے ہرگز نہیں۔

لہٰذا یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اہل بیت اطہار کی مثال جب کشتی جیسی ہے تو اگر کوئی محض ان کی تعریف میں لگا رہے مگر ان کا اطاعت شعار نہ ہو مطیع و فرمانبردار نہ ہو ان کے حکم پر چلتا نہ ہو تو وہ ساحل مراد تک نہیں پہنچے گا۔ تو جس طرح ساحل پر کھڑے ہو کر محض کشتی کی تعریف کرنے والا دوسرے ساحل تک نہیں پہونچ سکتا بس ایسے ہی اہل بیت کی محض تعریف کرنے والا کبھی بھی ہدایت و نجات یافتہ نہ ہو سکے گا۔ تاوقتیکہ ان کا فرمانبردار اور اطاعت شعار نہ ہو۔

حضرات! اب یہیں پر ایک نکتہ اور ملاحظہ فرمائیں: میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں:۔

آپ خیال فرمائیں کہ اگر کشتی پر بیٹھ گیا تو آپ کو معلوم ہے کہ کشتی پر بیٹھنے والے کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کشتی میں سکون ہو تو اس پر بھی سکون، اگر کشتی جنبش میں آجائے تو اس کا بدن بھی ہل جائے کشتی کا رخ بدل جائے تو اس کا بھی رخ بدل جائے کشتی اگر بھنور میں گھوم جائے تو یہ بھی گھوم جائے۔

معلوم ہوا کشتی پر بیٹھنے والا اپنی حرکت و سکون میں کشتی ہی کے تابع ہوتا ہے اسمیں حرکت تو اس میں حرکت۔ وہ گھومے تو یہ بھی گھومے وہ ساکن تو یہ بھی ساکن۔ وہ متحرک تو یہ بھی متحرک۔

معلوم ہوا کشتی سوار اپنی نقل و حرکت وغیرہ میں کلیتہً کشتی ہی کے تابع ہے۔ لہٰذا یہ حقیقت کھل کر بے نقاب ہوگئی کہ جدھر اہلبیت کا رخ ہو۔ ادھر ان کے ماننے والوں کا بھی۔ جس سے علی مرتضیٰ امام حسن وحسین دوستی کریں۔ اس سے ان کا ماننے والا بھی دوستی کرے۔ ایسا

ہرگز نہیں ہو سکتا کہ حضرت علی مرتضیٰ کسی کو اپنا دوست سمجھیں اور ان کا ماننے والا ان کے دوست سے عداوت کرے یہ حیدر کرار رضی اللہ عنہ کے منشا اور رضا کے خلاف ہے۔ اس طریقۂ کار میں حسنین کریمین کی خوشنودی کی بجائے دل آزاری کا پہلو غالب ہے۔ ان کے نرم و نازک دل کو تکلیف و صدمہ نہیں پہونچانا چاہیئے۔

اس مختصری وضاحت میں ستارہ اور کشتی کی مناسبت کو بہت ہی واضح کر دیا۔ اور یقین ہو گیا کہ نبی کا ایک حرف اور ایک جملہ ہزارہا صفحات کا بحر بیکراں ہوتا ہے۔ اور ایک کلمہ گو کو صحابہ و اہل بیت دونوں سے ہی عقیدت و محبت کا رشتہ رکھنا چاہیئے۔ یعنی

؎ تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

فالحمد للہ علیٰ ذالک

(۱)

حضرات! ایک حدیث میں نے اور پڑھی ہے:

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا

سرکار فرماتے ہیں میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازے ہیں۔ اس سے شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضل و کمالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے لہٰذا جسے علم کے شہر سے کچھ لینا ہو وہ ادھر ادھر سے نہ آئے، کوند پھاند کر آنے کی کوشش نہ کرے، چور دروازے سے داخلہ نہ لے بلکہ صدر دروازے سے آئے۔ اور وہ ہیں حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرات! اب سے پہلے رواج تھا کہ دارالسلطنت کی حفاظت کے لئے اس دیس کے راجہ مہاراجہ نواب اور سلاطین اپنے شہر کو چہار دیواری سے گھیر دیتے، مختلف سمتوں میں آنے جانے کے لئے دو ایک دروازے ہوتے

تھے جسے شہر پناہ کہتے تھے۔ آج بھی یہ دیواریں کہیں کہیں محفوظ ہیں۔ مثلاً برہان پور، اگرچہ دیواریں بہت ہی شکستہ ہوتی جارہی ہیں مگر شہر کا اکثر حصہ اس سے گھرا ہوا ہے۔ اور دروازے محفوظ ہیں۔ احمد آباد کے کچھ دروازے رہ گئے باقی دھیرے دھیرے منہدم کئے جارہے ہیں۔ بیجاپور میں بھی اس کے کچھ آثار باقی ہیں۔ راجستھان کے اکثر شہر میں اس کے کھنڈرات اور نشانات ملتے ہیں۔

اب اسی کی روشنی میں اس حدیث کا مفہوم سماعت فرمائیں:
سرکار فرماتے ہیں "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازے ہیں" اس دروازے نے کئی چیزوں کی نشاندہی کردی۔

حضرات! اگر شہر کے چہار جانب دیوار نہ کھڑی ہو تو شاہراہ سے چل کر جہاں سے داخل ہونا ہو وہاں اگر دروازہ بنا دیا جائے تو آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ آخر اس دروازے سے کیا فائدہ ہوگا، جب اس کے دائیں بائیں کھلا ہوا ہے۔ آدمی جدھر سے چاہے جہاں سے چاہے چلا جائے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ایک دروازہ اپنے ارد گرد دائیں بائیں دیوار چاہتا ہے۔

(۲)

حضرات! اگر دیواریں بھی تسلیم کرلی جائیں تو دیوار اپنی "نیو" اور بنیاد چاہتی ہے۔ اگر دیوار بغیر بنیاد کے ہو تو سطح زمین سے یہ اٹھی ہوئی دیوار نہ تو آندھی کا جھونکا برداشت کرسکتی ہے اور نہ ہی سیلاب کا دھارا اور ریلا۔ ایک ہی جھٹکے میں لیٹ جائے گی۔ لہٰذا ایک دانشور بغیر نیو اور بنیاد کے دیوار نہیں اٹھاتا۔

حضرات! نیو اور بنیاد ہم نے مانا اور دیوار بھی مگر یہ بتائیے کہ اگر کہیں اس پر چھت نہ ڈالی جائے تو شہر کا نگراں، عمال، محافظ دستہ، آفس کے کلرک یہ سب کہاں اور کس طرح اپنی ڈیوٹی انجام دے سکیں گے! اور گرمی کی

دھوپ اور اس کی تپش سے محفوظ رہ سکیں گے۔ اور موسم سرما کی ٹھنڈی لہر اور موسم برسات میں بارش اور اولوں سے بچ سکیں گے؟ اس لئے چھت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا پتہ چلا کہ ایک کارآمد دروازہ اپنے وجود میں نیو بنیاد، دیوار اور چھت سب کو چاہتا ہے۔

اب آئیے! شہر علم کی نیو، دیوار اور چھت کا سراغ لگائیں:

حضرات! جب ہم نے واقعات و حقائق کی روشنی میں اس کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ خلیفۂ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیق اس کی نیو اور بنیاد ہیں۔ اور خلیفۂ ثانی حضرت سیدنا امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی دیوار ہیں۔ اور خلیفۂ سوم حضرت سیدنا امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ اس کی چھت ہیں۔ اور خلیفۂ چہارم حضرت سیدنا امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے دروازے ہیں۔

ایک نکتہ:۔ حضرات! ایک دیوار کے اٹھانے میں جو ترتیب پائی جاتی ہے یعنی پہلے نیو بنیاد، پھر دیوار، پھر چھت بعد اور آخر میں دروازہ بس بعینہٖ اسی ترتیب سے خلافت راشدہ بھی ہے۔

بنیاد پہلے ہوتی ہے تو حضرت سیدنا ابوبکر صدیق کی حیثیت بنیاد جیسی ہے۔ وہ پہلے خلیفہ بھی ہیں۔ اسی طرح اس کے بعد مرتبہ دیوار کا ہے حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس کی دیوار ہیں اور خلیفۂ ثانی بھی ایسے ہی اس کے بعد تیسرا مرتبہ چھت کا ہے سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ اس کی چھت کی مانند ہیں۔ اور خلیفۂ سوم بھی۔ آخری مرتبہ دروازے کا ہے اور شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی حیثیت مانند دروازہ کے ہے۔ اور وہ چوتھے خلیفہ بھی ہیں۔

حضرات! اگر سنجیدگی اور متانت سے حدیث مبارکہ پر غور کیا

جائے تو اسی حدیث مبارکہ میں ترتیب خلافت بھی پائی جاتی ہے۔ گویا اشارے کی زبان میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم فتنے کا سد باب فرمایا ایک مکان کی تعمیر میں بنیاد، دیوار، چھت، دروازہ میں جو ترتیب پائی جاتی ہے صدیق صمد ہی ترتیب خلافت بھی ہے۔

ایک سوال:۔ اگر کوئی یہ کہے کہ شہر میں جانے کے لئے ہمیں دروازے کی ضرورت نہیں۔ اس سے پوچھئے آخر کیسے جاؤ گے؟ نقب لگا کر، کمند پھینک کر، اچھل کود کے۔ تم اپنے جانے کی نوعیت تو بتاؤ؟

بہر حال اگر وہ صمد دروازے کو چھوڑ کر ان میں سے کوئی بھی صورت اختیار کرتا ہے تو خود اس نے اپنا رشتہ اور تعلق ظاہر کر دیا ایسے وہ کون لوگ ہیں جو رات کی تاریکی میں کسی دیوار میں نقب لگاتے ہیں، کمند پھینک کر اس کے ذریعہ داخل ہوتے ہیں۔ مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ آپ ذہن پر زور دے کر خود ایسے مجرم کی کلائی تھام لیجئے تاکہ شریعت اسلامیہ کا محافظ دستہ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑی پہنا سکے۔

ھ تو خود حدیث مفصل بحوالہ ازیں مجمل۔

نکتہ:۔ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازہ۔

آپ پر یہ حقیقت واضح رہے کہ عمارت بننے کے بعد دروازہ تعمیر نہیں کروایا جاتا بلکہ عموماً دروازہ پہلے ہی تیار رہتا ہے۔ معلوم ہوا تیار رہنا اور ہے اور عمارت میں فٹ کرنا، لگانا، اس کی زینت بنانا اور ہے اور یہ کام بوقت ضرورت ہی ہوتا ہے۔

بس اسی طرح کی مناسبت ترتیب خلافت میں بھی ہے۔

حضرات! شیرِ خدا علی مرتضٰے رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دروازہ فرماکر سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے شیرِ خدا کی قدآور شخصیت کو بہت ہی ممتاز اور بلند فرما دیا۔

یاد رہے ایوانِ شاہی ہو یا سلاطین کا محل، راجاؤں کی کوٹھی ہو یا کسی تاجدار کا قلعہ معلیٰ ان تمام عمارتوں کا وقار اس کا صدر گیٹ، اور دروازہ ہے۔ عمارت کے بقیہ حصوں پر اتنی رقم نہیں خرچ کی جاتی جتنا کہ دروازے پر خرچ کی جاتی ہے۔

حضرات! احادیث مبارکہ کی تشریح کے بعد اب جس آیت کی تلاوت کی گئی اس کے ترجمے اور اس کے متعلقات کی تشریح سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے آپ آیت کا مفہوم سماعت فرمائیں۔

خدائے وحدہ لاشریک لہ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"اے ایمان والو تم صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ مدد طلب کرو، مدد مانگو۔ بیشک اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے! اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کئے گئے تم انھیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں"

پہلی بات تو آپ یہ خیال فرمائیں نماز اللہ نہیں غیر اللہ ہے۔ نماز ارکان مخصوصہ کی ادائیگی اور اس کے مجموعہ کا نام ہے۔ نماز اللہ کے لئے پڑھی جاتی ہے مگر نماز اللہ نہیں، غیر اللہ ہے۔ ایسے ہی صبر بھی اللہ نہیں غیر اللہ ہے۔ آلام و مصائب اور بے پناہ کٹھنائیوں میں روتے دھوتے شور و غوغا، آہ و بکا، نالہ و شیون اگر یہ و ماتم کی بجائے صبر و تحمل سے کام لینے کا نام صبر ہے۔ گویا بندے کی ایک مخصوص صفت کا نام صبر ہے مجھے اس مقام پر شفیق جون پوری کا بکھرا ہوا کردار یاد آیا:-

صلاح الدین ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ۱۸ سال کا نوجوان، ٹھیک عنفوان شباب میں وہ داغ مفارقت دے گیا۔ شفیق کا میلاد خوان خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے والد انیس خاں جونپوری بھی محفل میلاد پڑھتے تھے۔ ایک ایک روز میں اٹھارہ بیس پروگرام، فجر سے ظہر تک ظہر سے عصر، اور عصر سے مغرب پھر مغرب سے عشاء اور عشاء کے بعد رات اپنی تھی۔ جب تک محافل کا سلسلہ چلتا رہا گھر میں جوان بیٹے کی نعش رکھی رہی مگر شفیق میلاد شریف کے جتنے پروگرام لے چکے تھے سب کو پورا کر رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا تمہیں کیا ہو گیا اکلوتے بیٹے کی میت گھر میں پڑی

ہے اور تم گھر گھر میلاد پڑھ رہے ہو۔

شفیق نے جواب دیا خدا کی دی ہوئی امانت تھی اس نے لے لیا اب وہ تو ملتا نہیں پھر اللہ کے رسول کی میلاد شریف کیوں چھوڑی جائے یہی وہ مقام ہے جہاں بندے کو صابر و شاکر کہا جاتا ہے۔

معلوم ہوا صبر اور نماز دونوں ہی غیر اللہ ہیں۔ اور خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کو ان سے مدد مانگنے کو حکم دے رہا ہے۔ اس میں نام نہاد مدعیان اسلام کے کھوکھلے نعرے کا بھرم کھل گیا جو یہ کہتے ہیں کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہے۔ اگر غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو ایسا حکم دیتا ہی کیوں؟

تمہارے کہنے کے بموجب یہ ہوا کہ گویا خود خدا اپنے مومن بندوں کو شرک کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ العیاذ باللہ من ذالک۔

لہٰذا یہاں یہ بات واضح ہو گئی کہ غیر اللہ کو غیر اللہ سمجھ کر اس سے مدد مانگنا شرک نہیں ہے۔ البتہ غیر اللہ کو معاذ اللہ، اللہ سمجھ کر مدد مانگنا یہ کھلا شرک ہے۔ لہٰذا اگر آج سنی مسلمان اللہ کے ولیوں سے استعانت و مدد چاہتا ہے تو انھیں اللہ سمجھ کر نہیں بلکہ اللہ والا سمجھ کر، خدا نہیں بلکہ محبوب خدا سمجھ کر۔

حضرات! اگر کوئی بہلا وا دینا چاہے، بھٹکانا اور گمراہ کرنا چاہے کہ سورۂ فاتحہ میں تو ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْن۔ ہم تجھ ہی کی عبادت کریں اور تجھ ہی سے مدد چاہیں پھر غیر خدا سے کیوں مدد مانگی جائے۔ تو آپ اس کی گوشمالی کیجئے کہ اے عقل کے دشمن! کیا تو ان لوگوں میں ہے کہ قرآن کے بعض حکموں پر ایمان لایا اور بعض پر نہیں۔ اگر سورۂ فاتحہ قرآن ہے تو یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر و الصلوٰۃ بھی تو قرآن ہی ہے۔ وہاں بندہ سے کہلوایا جا رہا ہے ہم تجھ ہی

سے مدد چاہیں ہم تجھ ہی سے مدد مانگیں مگر یہاں تو خود خدا بندوں کو حکم دے رہا ہے اسے ایمان والو صبر اور نماز سے جو غیر اللہ ہیں ان سے مدد مانگو۔

استعانت مصدر ہے۔ استعین جمع متکلم کا صیغہ ہے اسی استعانت سے استعینوا صیغہ امر ہے وجہ کیا ہے کہ نستعین کو مانا جائے۔ اور استعینوا کو چھوڑ دیا جائے۔ کہیں "چنیا بیگم" نے افیون کی گولی تو نہیں کھا رکھی ہے۔

حضرات! اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مددگار حقیقی پروردگار عالم ہے اور اسی کی بخشی ہوئی قدرت واجازت سے اللہ کے بندے بھی بندوں کی مدد کرتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ میں یہ تصور غالب ہے کہ ہم تجھ کو ہی خالق حقیقی اور معبود برحق سمجھ کر مدد مانگتے ہیں۔ اور استعینوا میں حکم دینے کا مقصد یہ ہے کہ غیر اللہ کو غیر اللہ سمجھ کر ہی مدد مانگو اور اسمیں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن اس براہین دلائل اور گفتگو کے بعد بھی کوئی کہے کہ غیر اللہ کو غیر اللہ سمجھ کر بھی ان سے مدد مانگی جائے تو یہ شرک ہے تو حضرات میری جرأت وبے باکی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ خدا کا یہ حکم عام بندوں کے لئے نہیں ہے بلکہ اس میں مخاطب مومن ہیں۔ لہٰذا جو مومن ہوگا وہ اس حکم خداوندی کو تسلیم کرے گا۔ بھلا کافر اسے کیوں مانے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں اس کا مخاطب ہی نہیں ہوں فالحمد للہ عن ذالک۔

حضرات! آیت کے دوسرے ٹکڑے میں ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں تم لوگ انھیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

شہدائے کرام کی حیات پر نص قطعی ہے جسمیں شک وشبہ اور ظن د

گمان کو کوئی دخل نہیں۔

نکتہ:۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے یہ فرمادیا انھیں مردہ مت کہو تو اس منفی پہلو میں حیات کا مثبت پہلو خود ہی متعین ہوگیا یعنی جب انھیں مردہ نہ کہا جائے گا تو یقیناً وہ زندہ ہیں انھیں زندہ ہی کہا جائے گا۔

لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کو مردہ نہ کہنے میں ان کا زندہ ہونا ثابت ہوگیا تو قرآن نے پھر اس قید کا اضافہ کیوں کیا؟ "بل احیاءٌ" بلکہ وہ زندہ ہیں۔

حضرات! میں برابر عرض کرچکا ہوں کہ نزول قرآن میں مزاج انسانی اور اس کی نفسیات کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن فہم انسانی سے دور ہوکر چیستاں اور پہیلی ہوجاتا۔ اور یہ قرآن کے مقصدِ ہدایت کے منافی ہے۔

دیکھئے اس سلسلے میں ہمارا اور آپ کا مزاج ایسا واقع ہوا ہے کہ ہم اور آپ دیکھتے ہیں کہ اندھا ہے مگر بتقاضائے ادب اندھے کو اندھا کانے کو کانا، لنگڑے کو لنگڑا نہیں کہتے۔ اس نہیں کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ کانا نہیں ہے۔ لنگڑا نہیں ہے اور عیبی نہیں ہے یعنی ہے تو کانا مگر کہو مت۔ ہے تو اندھا مگر کہو مت، ہے تو عیبی مگر کہو مت ایسے ہی اگر قرآن صرف اتنا ہی کہہ کر گذر جاتا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انھیں مردہ مت کہو تو یہ شبہ پیدا کیا جاسکتا تھا کہ وہ مر تو گئے ہیں مگر چونکہ خدا کی راہ میں مارے گئے ہیں لہٰذا احتراماً انھیں مردہ مت کہو۔ اس شبہہ کے ازالے کے لئے خدا نے یہ فرمادیا کہ "بل احیاء" بلکہ وہ واقعتاً زندہ ہیں۔ اگر میت کی یہ قید نہ ہو تو حیات شہداء مشکوک ہو

مشتبہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ "بل احیاء" کی مثبت قید نے شہدائے کرام کی حیات پر اب ایسی مہر لگا دی جس سے ان کی حیات کا انکار قرآن کے انکار کا مترادف قرار پائے گا۔

اب یہاں ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ ہیں تو نظر کیوں نہیں آتے۔ ملتے جلتے کیوں نہیں؟ ان سے مصافحہ و معانقہ کیوں نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔

حضرات! گلے کی رگیں پھلا کر سوال کرنا تو بہت آسان ہے، لیکن مسائل کی گہرائیوں میں اترنا سب کے بس کا کام نہیں۔ بقراط زمانہ کہتے تو ہیں کہ وہ ملتے کیوں نہیں؟ لیکن اگر کبھی ایسا ہی ہو جائے تو جناب ہی کا ہارٹ فیل ہو گا۔ مثلاً آپ کی آبادی میں اگر کوئی شہید ہو جائے دیوار کے گر جانے سے پانی میں ڈوب جانے سے وغیرہ وغیرہ۔ اور بعد نماز ظہر آپ دفنا دیں لیکن عصر بعد آفتاب ڈوبتے ڈوبتے وہی شہید آپ کے دروازے پر آ کے کھڑا ہو جائے، آبادیوں میں ٹہلنے گھومنے لگے تو نہ تو اس سے کوئی سلام کرنے آئیگا اور نہ ہی مصافحہ و معانقہ کرنے آئے گا۔ گھر کا دروازہ بند کر دیا جائے گا! دریچوں کو گھر کی کالی کوٹھری میں بند کر دیا جائے گا۔ اس وقت جتنے منھ اتنی بات۔ یہ بھوت کہاں سے آ گیا۔ یہ زندہ کیسے ہو گیا یہ شیطان تو نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ ایک نظام قدرت ہے۔ اسی لیے اس شبہہ کے ازالے کے لئے قرآن نے یہ کہا ولکن لا تشعرون یعنی شہید زندہ تو ہے مگر اب وہ ایسی زندگی میں ہے کہ تم کو اس کا شعور نہیں۔ یہ قید اسی شبہ کا جواب ہے یعنی "بل احیاء" نے ان کی حیات حقیقی پر مہر لگا دی اور

ولکن لا تشعرون کی قید نے ذہنی اختراع کے مزعومات کا بطلان ظاہر کر دیا۔

ہو سکتا ہے کہ اس واضح گفتگو کے بعد کوئی اڑیل گھوڑا کیطرح ہی کیے جائے۔ ایسی زندگی کس کام کی کہ زندہ ہو مگر دیکھنے میں نہ آئے تو حضرات اب آپ کتب خانہ کی سیر نہ کریں بلکہ یہیں بیٹھے رہیں مسئلہ حل کئے دیتا ہوں مسلمان ہونے کے ناطے ہم یہ بات کہتے ہیں کہ ہمارے دونوں کاندھے پر دو فرشتے ہیں جو ہماری نیکی و بدی لکھا کرتے ہیں۔

اب میں آپ لوگوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ لکھنا یہ مردے کا کام ہے یا زندہ کا۔ یقیناً آپ کا یہی جواب ہوگا کہ زندے کا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ فرشتے کا وجود بھی ہے اور وہ زندہ بھی ہیں جب ہی تو وہ ہماری نیکی بدی لکھتے ہیں۔ اب میں آپ ہی سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہر زندہ کو دیکھنا ضروری ہے تو اپنے کاندھے کے فرشتے سے کتنی بار ملاقات کی آپ نے کتنی بار مصافحہ و معانقہ کیا۔ کتنی بار مہمان نوازی کی ہے۔؟

معلوم ہوا کہ فرشتے کا وجود بھی ہے اور زندہ بھی۔ مگر ہم انھیں دیکھ نہیں پاتے۔ یعنی اللہ کی مخلوقات سے بعض ایسی مخلوق ہے کہ اس کا وجود ہے اسے ہماری آنکھ دیکھ نہیں پاتی۔ بس ایسے ہی شہدائے اسلام پر اللہ تبارک و تعالےٰ کا یہ انعام و اکرام ہے کہ جب تک انھوں نے یہ قربانی نہیں دی تھی انھیں لباس کثیف پہنایا گیا تھا۔ اور جب انھوں نے جان جیسی پیاری دولت کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا تو اب خدا نے انھیں ایسا لطیف لباس پہنایا ہے کہ وہ زندہ ہیں مگر ہماری آنکھوں کی گرفت میں نہیں آتے۔ ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ ذو الفضل العظیم

منصبِ ولایت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی حَبِیْبِہِ الَّذِی اصْطَفٰی۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ۝

ملنے کی یہی راہ نہ ملنے کی یہی راہ
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہ گزر ہے

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے "منصبِ ولایت"

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

چونکہ آج مجھے اللہ کے ان برگزیدہ بندوں اور قدسی نفوس ہستیوں کا ذکر کرنا ہے جن کو ہم بزرگانِ دین اور اللہ کا ولی کہتے ہیں اس لئے قرآن کریم کے گیارہویں پارہ کی ایک ایسی آیتِ مبارکہ کی تلاوت کی ہے جس میں خدائے ذوالجلال نے انھیں قدسی صفات کا ذکر کیا ہے اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ۝

تلاوت کی ہوئی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ: متنبہ ہو جاؤ، بے شک اللہ کے دلیوں کے لئے نہ کوئی غم ہے نہ حزن و ملال۔ وہ ایسے لوگ ہیں، جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔

ایک نکتہ:- حضرات! عام اصول یہ ہے کہ پہلے کسی شے کی تعریف کی جاتی ہے پھر اس کے احکام یا محاسن و فضائل بیان کئے جاتے ہیں مگر قرآن نے یہاں ترتیب بدل دی ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ پہلے ولی کی تعریف بیان کی جاتی، پھر ان کے محاسن واوصاف۔ لیکن آیت میں پہلے ان کے علوئے مرتبت، درجات و مراتب، فوقیت و برتری کا اعلان، و اظہار ہے کہ وہ ہیں کہ انھیں کوئی خوف نہیں اور انھیں کوئی ملال نہیں۔

یہ ولی کی تعریف نہیں ہے بلکہ عام انسانوں سے ان کی جداگانہ حیثیت کا اعتراف اور اس کا اظہار ہے۔ اس کے بعد کے ٹکڑے میں ان کی تعریف ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔

حضرات! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسا کیوں ہے؟ میں نے اور بھی کہیں آپ کو بتایا ہے کہ قرآن کی ترتیب بے معنی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں بھرپور معنویت ہوتی ہے۔

یہاں ترتیب بدلنے کا فائدہ یہ ہے کہ جب قرآن یہ کہے گا کہ یہ وہ مقدس گروہ ہے، جس پر سے غم اور ملال اٹھا لیا گیا ہے تو انسانیت کے کان کھڑے ہو جائیں گے کہ پوری دنیائے اسلام خوف اور امید کے درمیان ہے۔ "الایمان بین الخوف والرجاء"

مگر وہ کون سے مقبول و محبوب بندے ہیں، جن سے خوف و ملال اٹھا کے عام لوگوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ ترتیب بدل دینے کی وجہ سے شوق پیدا ہوگا۔ نیک پیدا ہوگی، رغبت اور جاذبیت ہوگی۔

لہٰذا پروردگارِ عالم عام بندوں کو اپنے محبوبوں کے ذکر اور ان کی یاد کی طرف شوق دلانا چاہتا ہے کہ دل کی تڑپ اور ذہن و فکر کے جھکاؤ کے ساتھ ان کی طرف دوڑو۔ اور ان کا ذکر سنو، بے دلی اور بے رخی سے نہیں بلکہ وارفتگیٔ شوق سے ان کی بارگاہِ کرم تک پہنچو۔

آیت کی ابتدا "اَلَآ" سے ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں "متنبہ ہو جاؤ! ہوشیار ہو جاؤ۔ خبردار ہو جاؤ"۔ جہاں کہیں، جب کبھی، کسی حکم و ذکر کا اہتمام مقصود ہوتا ہے اور اس کی اہمیت بتانی ہوتی ہے تو قرآن کا مزاج یہی ہے کہ وہ ایسے حروف سے بیان کی ابتدا کرتا ہے کہ سننے والے کا ذہن فوراً اس کی طرف منتقل ہو جائے تاکہ پوری یکسوئی اور دل کی لگن سے آنے والے حکم یا بیان کو سن سکے۔

"اَلَآ" سے ابتدا کر کے پروردگارِ عالم کا یہ بھی اشارہ منظور و مقصود ہے کہ یہ کسی ایرے غیرے اور معمولی لوگوں کا ذکر نہیں ہونے جا رہا ہے بلکہ میرے ان چہیتے اور محبوب بندوں کا ذکر ہے کہ اگر تم ان سے قریب ہو گئے تو گویا اللہ سے قریب ہو گئے۔

حضرات! یہیں پر یہ گوشہ بھی حل کر لیں تو آگے بڑھیں۔ تاکہ آیت کا مفہوم کسی حد تک واضح ہو جائے۔ پھر اس مسئلہ کو نکات، اور واقعات کے آئینے میں دیکھا بھالا جائے۔

نکتہ: سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سے خوف اور حزن و ملال کیوں اٹھا لیا گیا۔

حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس باب میں سنتِ الٰہیہ کچھ ایسی ہے کہ جو نہیں ڈرتا اسے ڈرایا جاتا ہے۔ اور جس نے ڈرنے کا حق ادا کر دیا اس پر سے خوف اور ملال کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ کے یہ برگزیدہ بندے جن کا دل ہمیشہ خشیتِ الٰہی سے معمور و سوز

وگداز کی دھڑکنوں سے بیدار اور رضائے الٰہی کی تجسس وتلاش میں آنکھیں اشکبار رہتی ہیں۔ پھر ان پر انعام الٰہی کی موسلا دھار بارش جتی کہ اللہ کے وہ عام بندے جو خوف اور حزن وملال کی آہنی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں، اس قید وبند سے انھیں یکسر رہائی مل جاتی ہے، کہ اب انھیں نہ تو اپنے ماضی کا غم رہتا ہے اور نہ ہی مستقبل کا ملال۔ غم کا تعلق ماضی سے ہے اور ملال کا مستقبل سے۔

انعام الٰہی کے یہ اثرات ونتائج اس حد تک مؤثر ہوتے ہیں کہ جوان سے قریب ہو جاتا ہے ان کے دلوں سے خوف وڈر جاتا رہتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ حضرت رابعہ بصریہ کی بکریاں شیروں کے ساتھ پنگھٹ اور چشمے پر پانی پیتی تھیں۔ حیرت زدہ لوگوں نے سوچا کہ شیر اور بکری کا گٹھ جوڑ کیسا؟ اس کا پانی کے ایک ہی چشمہ پر پانی پینا کیسا؟ شیروں کو انھیں پھاڑ ڈالنا چاہیئے۔ اور بکریوں کو انھیں دیکھ کر خوفزدہ اور نروس ہو جانا چاہیئے، لیکن یہ کیا ماجرا ہے کہ دونوں شیر وشکر ہو کر پانی پیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو خوف الٰہی اور خشیتِ ربی کے صحیح مفہوم سے ناواقف وناآشنا تھے انھوں نے اللہ کی ولیہ حضرت رابعہ سے دریافت کیا کہ اے رابعہ تمہاری بکری نے شیر سے کب سے دوستی کر لی ہے؟

حضرتِ رابعہ نے جواب دیا جب سے رابعہ نے اللہ سے دوستی کر لی ہے۔

آپ اس کی تفصیل تو آئندہ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس دوستی کے اثرات وثمرات ونتائج کیسے کیسے ہیں؟ کس کس روپ میں ہیں یہ ایک ضمنی اور ذیلی بات تھی جو چلتے ہوئے مضمون سے ملتی بندھی معلوم ہوئی اس لئے اس کا ذکر کر دیا۔

حضرات! اگر آیت کا صحیح مفہوم ذہن میں اتر گیا ہو تو اب اصل عنوان سے وابستہ ہو جائیں۔ میرا موضوع ہے "منصب ولایت" جس طرح صف انسانیت میں نبوت و رسالت ایک منصب ہے، ایسے ہی ولایت بھی ایک منصب ہے۔ فرق یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا منصب اعلان و اقرار لینے کا ہے یہ نبی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قوم اور اللہ کے بندوں میں اعلان کرے کہ میں اللہ کا نبی و رسول ہوں۔ یہ اعلان ہے، اور اس کے ساتھ پھر یہ بھی ہے کہ تم لوگ میری نبوت و رسالت پر ایمان لاؤ۔ یہ اقرار لینا ہے۔
یاد رہے کہ نبی و رسول اس اعلان و اقرار میں تواضع و انکسار سے کام نہیں لے سکتے۔
مثلاً اگر اللہ کے کسی بندے نے کہا کہ آپ نبی و رسول ہیں، مستجاب الدعوات ہیں، خدا کی بارگاہ میں آپ کا رتبہ و مرتبہ بہت ہی بلند و بالا ہے خدا آپ کی باتوں کو سنتا اور قبول فرماتا ہے تو نبی و رسول ہرگز ہرگز بطور تواضع و انکسار بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ نہیں نہیں مجھے ایسا نہ کہو، نبی و رسول نہ کہو۔ میں تو ایک معمولی درجہ کا بشر ہوں۔ معاذ اللہ!
چونکہ یہ منصب رسالت اعلان، اظہار اور اقرار لینے کا ہے، لیکن منصب ولایت اعلان و اظہار کا نہیں بلکہ چھپانے کا ہے اس کا ڈھنکا نہیں پیٹا جاتا۔ اور نہ ہی اس کا چرچا کیا جاتا ہے، نہ خود اس کا اعلان کرے اور نہ ہی مریدین کے اعلان کو پسند کرے، ان پر سختی سے پہرہ بٹھائے اس لئے کہ ان باتوں سے نفس موٹا ہوتا ہے، غرور و پندار جنم لیتا ہے اگر وہ راہ پر لگا ہوا ہے تو ترقی درجات کے راستے مسدود ہو جائیں گے اور صرف کولھو کا بیل ہو کر رہ جائے گا۔ شیطان کے اڑنگا مارنے کے بہت سے راستے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ حتیٰ کہ صوفیاء اہل اللہ فرماتے ہیں کہ ولی کو اپنی کرامت ایسی ہی چھپانی چاہیئے جیسے حائضہ عورت اپنے کرسف

یعنی حیض کے کپڑے کو چھپاتی ہے۔ معلوم ہوا یہ منصب اعلان کا نہیں، بلکہ چھپانے کا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ بعض سادہ لوح حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ولی وہ ہے جس سے کرامت کا صدور و اظہار ہو۔ اس راہ میں یہ ایک بہت بڑی بنیادی غلطی اور دھوکہ ہے۔

چنانچہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی بارگاہ میں ایک عقیدت مند مرید ہونے کی غرض سے حاضر ہوا۔ اور مسلسل تیس برس حضرت کی خدمت میں لگا رہا۔ اب ایک دن ایسا آیا کہ اس نے اپنا رخت سفر باندھا بوریہ بستر سنبھالا اور حضرت کی خدمت میں اجازت طلب کرنے کی غرض سے آیا۔ سلطان الاولیا حضرت سیدنا جنید بغدادی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا "کیسے آئے اور کیسے چلے" اتنے دنوں تک رہے مگر آج تک تم نے اظہار مدعا تک نہ کیا۔

اس نے عرض کیا حضور مرید ہونے کی غرض سے حاضر ہوا تھا مگر آج میں مایوس ہو کر جا رہا ہوں۔ میری امیدوں کا چراغ بجھ گیا۔ اور آرزوؤں نے آپ کی چوکھٹ پر دم توڑ دیئے ہیں۔ تمنائیں اس در پر تشنۂ تکمیل ہی رہ گئیں۔ اجازت دیجئے کہ قدمبوس ہو کر کسی اور آستانے کی تلاش میں لگ جاؤں۔

حضرت نے فرمایا! کہ ایسی کیا بات ہے، کچھ اس کی تفصیل تو سناؤ؟ اس نے عرض کیا حضور! آج تک اس ٹوہ میں لگا رہا کہ کوئی کرامت دیکھ لیتا تو مرید ہو جاتا۔ مگر اس طویل عرصے میں، میں نے کوئی ایسی بات نہ دیکھی جسے دل کرامت سمجھ کر جھک گیا ہوتا۔

حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا یہ سچ ہے کہ تم نے ہمیں

ہواؤں میں اڑتے نہیں دیکھا، نہ ہی سطح دریا پر مصلیٰ بچھاکر نماز پڑھتے دیکھا۔ اسکے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا "مگر یہ تو بتاؤ کبھی میرا قدم ایسا بھی اٹھا ہو جو خلاف سنت ہو اور میری زبان پر کوئی ایسا لفظ بھی آیا جو فرمان نبوی کے خلاف ہو،؟

یہ سنتے ہی اسکے دل کا دروازہ کھل گیا، آنکھیں ساون بھادوں کی طرح جھڑنے لگیں اور پھر گلو گیر اور گرفتہ آواز میں اس نے عرض کیا اپنا دستِ کرم بڑھا کر اپنی غلامی میں لے لیں۔

حضرت نے فرمایا، یہ بہت بڑی بنیادی غلطی ہے، کہ لوگوں نے کرامت کو "معیار ولایت" سمجھ رکھا ہے بلکہ اتباع سنت ہی معیارِ ولایت ہے۔ جو جتنا ہی متبع سنت ہوگا اسی قدر اسے قرب الٰہی حاصل ہوگا۔

یاد رہے تصوف کسی خاص لباس، گیر دالستر، اور رنگیلے شاہ کا نام نہیں ہے۔ اگر کسی خاص لباس کا پابند ہو تو اللہ سے ملنے کا یہ بہت آسان نسخہ ہے۔ آپ دھوکہ میں نہ آئیں۔ میں اپنے آپ کو زمزم و سلسبیل میں دھلا دھلایا تصور نہیں کرتا۔ گناہوں سے آلودہ، اور معصیت میں غرق زندگی کو بھلا کیا حق جو اللہ کے ان پاکیزہ بندوں پر نقد و نظر کرے۔ ابھی تو اسے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے

بہر حال! میں تو اس توفیق الٰہی پر بھی سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں۔ کہ خود بینی و خود پسندی کے روگ میں مبتلا نہیں، بلکہ اصلاحِ نفس کے لئے ناریک دل کا دروازہ کھلا ہے۔ شاید کہ یہی جذبۂ طلب کبھی کام آجائے۔ میری آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی ہے۔ میں اسے جانتا ہوں کہ پہلے مجھے اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ لیکن چالیس برسوں کی زندگی میں نے صرف سیر و تفریح میں ہی نہیں گذار دی بلکہ جہاں گیا ایک شن اور پروگرام

کے ساتھ گیا۔

مجھے الہ آباد میں بریلوی کہا گیا چونکہ اپنے اور بیگانے سبھی جانتے تھے کہ یہ اپنا وطن لے کر نہیں آیا بلکہ بریلی کے تاجدار، امام اہلسنت، سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالے عنہ کا مشن لے کر آیا ہے۔

جب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ ہاتھوں کی انگلیوں میں بجائے ایک کے کئی کئی انگوٹھیاں ہیں وہ بھی مختلف دھات کی ہیں بلکہ بعض بعض حضرات کی ایک ایک انگلی میں کئی کئی انگوٹھیاں۔ حالانکہ سرکار نے فرمایا، انگوٹھی صرف چاندی کی پہنی جائے وہ بھی ساڑھے چار ماشہ سے زائد نہ ہو جب کہ شریعت اسلامیہ نے ایک ایک چیز کی حد بندی کر دی ہے۔ پھر ان حدود سے تجاوز ہونا، وہ بھی کہیں اور نہیں خانقاہی زندگی میں سے

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ایسے ہی ، بال ، جس میں چوٹیاں گوندھی جائیں۔ میں جانتا ہوں چھوٹا منہ بڑی بات والی مثال صادق آرہی ہے لیکن خدا مجھے معاف کرے۔

بہرحال! گذارش یہ ہے کہ اللہ کی معرفت لباس یا عقل، اور کھوپڑی میں نہیں، اس کی جگہ ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے دل۔ جب رحمت باری اپنے کسی مخصوص بندہ کو نوازتی ہے تو اس کی تجلیات کا کاشانہ اور نشیمن صرف ، دل ، ہوتا ہے۔ یہیں اس کی تجلیات آتی ہیں اور یہیں سے پھوٹتی ہیں۔

میں اسی لئے کبھی کبھی درسگاہ اور خانقاہ کا فرق بیان کرتے ہوئے یہ عرض کرتا ہوں ، درسگاہ میں پڑھایا جاتا ہے اور خانقاہ میں پلایا جاتا ہے '' اس کی بحث کہیں گذر چکی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ درس گاہ میں عقل مانجی جاتی ہے اور خانقاہ میں دل صیقل کیا جاتا ہے۔ چونکہ دل کا برتن عقل ہے اور معرفت الٰہی کا آبگینہ دل ہے۔ اس لئے ایک عالم ظاہر طالب علم کی عقل کی دھار کو تیز کرتا ہے اور عالم باطن دل کو جلا دیتا ہے۔ وہاں علم آئے گا، یہاں معرفت آئے گی اور تیسرا فرق یہ ہے کہ اگر درس گاہ میں کوئی دیوانہ داخلہ لے تو اسے دانا بنایا جاتا ہے۔ اور اگر خانقاہ میں کوئی دانا آئے تو اسے دیوانہ بنایا جاتا ہے۔

دیکھو! ہماری درسگاہ دارالعلوم غریب نواز میں طالب علم اپنے استاد سے سوالات پر سوالات کرتا ہے۔ جیسے ہی استاذ نے پڑھایا الکلمۃ۔ فوراً طالب علم سوال کرنا شروع کر دے گا۔ حضرت! یہ کلمہ پر الف لام کیسا ہے؟ استغراق کا ہے، یا عہد خارجی ہے عہد ذہنی ہے یا عہد جنسی ہے یا تحسین کلام کے لئے ہے اگر وہ ہے تو یہ کیوں نہیں؟ یہ ہے تو وہ کیوں نہیں؟ اور آخر کی "ۃ" کیسی ہے، لفظ کلمہ کس سے مشتق ہے؟

سوالات کی بوچھار میں استاذ جواب دیتا جا رہا ہے۔ ایک منجھا منجھایا، تجربہ کار اور لائق و فائق مدرس کبھی طالب علم پر نہ تو کوئی بندش لگائے گا اور نہ ہی اپنے علمی رعب و جلال کا پہرہ بٹھائے گا۔ بلکہ اس کی ذکاوت و خطابت کو داد و تحسین دیتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کرے گا تاکہ خوب خوب بولے اور خوب خوب سمجھے۔ اگر یہ آج ہمارے یہاں نہ بولے گا تو کل میدان مناظرہ کیسے جیتے گا۔ اسے مدرس بھی ہونا ہے مفتی بھی، صاحب قلم اور صاحب زبان بھی۔ مقرر اور مناظر بھی گویا یہ ایک درس گاہ بھی ہے اور تربیت گاہ بھی۔

یہ وہ تربیت گاہ ہے جہاں دیوانہ کو دانا بنایا جاتا ہے اس کے

برخلاف اگر کوئی شخص سیدی سرکار مفتیٔ اعظم رضی اللہ عنہ سے داخل سلسلہ عالیہ رضویہ ہوا۔ اور حضرت یہ فرماتے کہ روزانہ بعد نماز فجر ۱۴ بار، اول وآخر درود شریف کے ساتھ "رحمٰن" پڑھ لیا کرو۔

اب وہ عرض کرتا حضور! ۱۴ بار کیوں؟ ۱۴۰ بار کیوں نہ پڑھ لیا کریں؟ تو حضرت اسے شاباش نہیں دیتے بلکہ مسکراتے ہوئے فرماتے۔ "بھول ہوگئی مرید تم کو نہیں مجھ کو ہونا چاہئے تھا۔" اس لئے کہ یہ درسگاہ نہیں ہے خانقاہ ہے۔ یہاں دانا نہیں دیوانہ بنایا جاتا ہے مگر ایسا دیوانہ جس پر ہزار ہا فرزانگی قربان۔

بہرحال گفتگو یہ چل رہی تھی کہ عالم ظاہر عقل کی قلعی کرتا ہے، اور عالم باطن دل کو صیقل کرتا ہے۔

حضرات! اتنی بڑی تعداد میں آج مخلوق الٰہی ان بندگان خدا کے آستانہ جات پر حاضری دیتی ہے۔ آخر وہ کون سی کشش اور مقناطیست ہے کہ لاکھوں انسانوں کا میلہ چھٹی رجب کو میرے غریب نواز کے یہاں لگ جاتا ہے۔

نکتہ:۔ یہ ہم میں رہے مگر ہماری طرح نہیں رہے۔ ہم دل بدلی میں لگے رہے اور یہ دل بنانے میں رہے۔ یہ مقام و مرتبہ انہیں صرف کپڑا پہننے سے حاصل نہیں ہوگیا۔ بلکہ اس دل کو عشق الٰہی کی بھٹی میں سلگایا ہے۔ یہ دنیا مقام عبرت ہے مگر اس سے ہم سبق حاصل نہیں کرتے۔ دیکھئے ہمارے گھروں میں تانبے کی پتیلی ہوتی ہے۔ مدتوں بغیر قلعی پڑی رہتی ہے۔ ہمارے یو۔پی کا رواج یہ ہے کہ بچیوں کی شادی میں تانبے کے برتن بغیر قلعی ہی دیئے جاتے ہیں۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ اگر اس پر قلعی کر دی جائے تو یہ صحیح اندازہ نہ ہوسکے گا کہ یہ نیا برتن ہے یا پرانا اس لئے اس پر قلعی نہیں کراتے۔

برسوں کی زنگ آلود پتیلی گھر میں رکھی ہے۔ اب اسے استعمال کی ضرورت پڑ گئی تو آپ بغیر قلعی کے اسے استعمال نہیں کر سکتے۔ ورنہ کھانے میں سمیت آجائے گی۔ زہر کا اثر آجائے گا۔ لہٰذا آپ کہاں گئے؟ قلعی گر کے یہاں۔ قلعی گر پتیلی کو لے کر فوراً قلعی نہ کر دیتا بلکہ اس کے یہاں چند جوان بچے ملازم ہیں یہ پتیلی اس کو دیدیتا ہے اور لڑکے اس میں "جھاواں" زیادہ پکی ہوئی اینٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ڈال کر اور اس پر وہیں کپڑے کو بچھاتا ہے، پھر اس میں دونوں پاؤں ڈال کر اسے پاؤں سے رگڑتا اور مانجتا ہے۔ گویا پتیلی دیدہ وروں کے لئے مقام عبرت بن کر اپنی خاموش زبان میں یہ کہہ رہی ہے کہ اے لوگو مجھ سے سبق حاصل کرو۔ کہ جب میں نے یہ چاہا کہ میں چمک جاؤں تو مجھے کسی کے پاؤں کی ٹھوکر میں آنا پڑا۔ پائمال کی جا رہی ہوں روندی جا رہی ہوں، ٹھکرائی جا رہی ہوں۔ چونکہ مجھے چمکنا ہے۔ پھر وہ جوان بچے اس پتیلی کو قلعی گر کے سپرد کرتے ہیں۔ قلعی گر واپس کر دیتا ہے کہ ابھی اس کا زنگ نہیں چھوٹا۔ زنگ اور قلعی اکٹھا نہیں ہوتے۔ اس کو اور مانجو۔ پھر پاؤں کی ٹھوکریں لگیں۔ اب قلعی گر چھو منتر کے ذریعہ اسے نہیں چمکاتا بلکہ آگ کی بھٹی میں ڈال دیتا ہے وہ دیر تک انگاروں اور شعلوں پہ سلگتی ہے۔ جب خوب دہک جاتی ہے تو قلعی گر تھوڑا سا رانگا پھیر دیتا ہے۔ اس کو اور جلا دینے کے لئے آمیزش کر دیتا ہے۔ اب وہی جو زنگ آلود تھی اس کی آب و تاب پر آنکھ نہیں ٹھہرتی۔

آپ جیسے دانشوروں نے سمجھ لیا ہوگا کہ پتیلی جب چمکنا چاہتی ہے تو ہزار ہا مصیبتوں سے گزرنے کے بعد تب کہیں قابل استعمال ہوتی ہے۔ ؎

کتنے عالم ہیں کہ غنچوں پہ گزر جاتے ہیں
تب کہیں جا کے وہ رنگین قبا ہوتی ہے

بس ایسے ہی جب اللہ کا ایک بندہ یہ چاہتا ہے کہ یہ دل انوار الٰہی سے مجلّٰی و مصفّٰی ہو جائے یہ سینہ اس کی معرفت کا گنجینہ بن جائے اور اس کی سانس یاد الٰہی کا نمونہ بن جائے تو قدرت اشارہ کرتی ہے کہ یہ مقام ایسے نہ حاصل ہوگا۔ بلکہ پہلے اپنے آپ کو عشق الٰہی کی بھٹی میں ڈالدو۔ کسی اللہ والے کے آستانہ کی دریوزہ گری کرو۔

جب کوئی ان منزلوں سے گذر جاتا ہے تو پھر دل خاک کندن بن کر چمکنے لگتا ہے۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ کچھ روٹیاں پکا کر آپ کو دیدیتیں۔ اور سلطان المشائخ اسے لے کر آبادی سے باہر کہیں چلے جاتے اور دن رات اللہ کی یاد میں لگے رہتے۔ ذکر و فکر میں رہتے اور انھیں خشک روٹیوں پر گذارہ کرتے پھر آتے اور روٹیاں لے کر چلے جاتے۔

بطور آزمائش ایک بار آپ کی والدہ نے فرمایا: بیٹے قریب آؤ تمہارے بال بڑھ گئے ہیں۔ دیکھیں اس میں جوئیں تو نہیں پڑ گئیں ہیں؟ ماں نے شہزادے کا سر زانو پہ رکھ لیا اور سر کے بال کو چٹکیوں سے لے کر کچھ زور سے کھینچا تو آپ نے آہ اور اُف کیا۔ ماں نے یہ کہہ کر زانو سے سر ہٹا دیا کہ شاہزادے تمہیں ابھی اپنے جسم کی تکلیف کا احساس باقی ہے۔ ارے یاد الٰہی میں اتنے مستغرق ہو جاؤ، ڈوب جاؤ کہ بدن کی تکلیف کا احساس تک نہ رہے۔

اسی طرح آتے جاتے والدہ محترمہ نے پھر امتحان لیا، دسترخوان طرح طرح کی نعمتوں سے چن دیا۔ سامنے بجائے دہی کے چونا رکھدیا۔ آپ نے اسے دہی سمجھا اور تناول فرمالیا۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ بیٹے کو اب زبان کی لذت و چٹخارہ کا احساس ختم ہو گیا۔

حضرات! اس طرح ماں نے اپنے صاحبزادہ کی تربیت کی اور اللہ کے دوست کو امتحانات کی مختلف منزلوں سے گذرنا پڑا۔ تب فرمایا جاتا ہے اب ان کے لئے غم نہیں اور کوئی ملال نہیں۔

معلوم ہوا طریقت کی راہ میں ساری کائنات یہ دل ہے اسی لئے آقائے دو جہاں نے اسی کی اصلاح پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے اِنَّ فِی جَسَدِ الْاِنْسَانِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ سرکار فرماتے ہیں کہ تمہارے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اس کی اصلاح ہو گئی تو گویا پورے بدن کی اصلاح ہو گئی اور اگر اس میں فساد ہو گیا تو گویا پورا بدن بگڑ گیا وہ دل ہے۔ بھلا وہ کس کام کا جو تن کا اجلا اور من کا کالا ہو۔ اسی خطرے کے پیش نظر کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اسی لئے تصوف کی روح اور طریقت کی جان قلب کی تطہیر اور پاکیزگی ہے جس نے اسے سنوارا وہ سنور گیا، جس نے اسے بگاڑا وہ بگڑ گیا۔

اب آئیے دل کی مثال ملاحظہ فرمائیے:

نکتہ: حضرات! دل کی مثال موم جیسی ہے جسطرح موم کا ایک ٹکڑا ہمارے اور آپ کے ہاتھوں کا گویا کھلونا ہوتا ہے ہم چاہیں تو اسے گیند بنالیں، چاہیں شمع بنالیں۔ اگر دل چاہے تو اسے مکعب بنالیں۔ طشتری اور گلاس بنالیں۔ غرض کہ جس شکل و ڈھب میں ڈھالنا چاہیں ڈھال لیں۔

بس کچھ اسی طرح قلب انسانی بھی خواہشات نفس کا کھلونا ہے

اس کے اشارہ پر پتہ کی طرح ڈولتا رہتا ہے۔ اسے کہیں قرار نہیں نفس جدھر کہے ادھر جائے۔ جیسا کہے ویسا کرے۔

لیکن موم میں صرف ایک باریک سا دھاگہ ڈال دیجئے۔ تو اب اس کی شکل بدل گئی۔ اس کا نام بدل گیا۔ اب اسے موم نہیں کہتے بلکہ اسے "موم بتی" کہتے ہیں۔ اب اس میں سختی اور توانائی آگئی۔ اسی طرح یہ دل خواہشات نفسانی کا کھلونا تو ہے مگر جب سنورنا اور بننا چاہتا ہے تو اللہ کے کسی ولی کا دامن تھامتا ہے۔ وہ مرشد کامل اپنی عقیدت و محبت کے دھاگے میں اسے منسلک کر لیتا ہے۔ اب یہ دل آزاد نہیں رہ گیا۔ یہ چھیڑا و بے لگام نہیں رہا۔ بلکہ پیر کی محبت کے دھاگے میں گرفتار ہو گیا۔

حضرات! موم میں دھاگا لگا یا تو اب وہ موم نہیں "موم بتی" ہے مگر یہ تو بتلائیے کیا موم بتی اسی لئے بنائی گئی ہے کہ اسے آہنی الماری یا تجوری میں رکھا جائے؟ یقیناً آپ کہیں گے نہیں۔ آخر پھر کس لئے بنایا ہے؟ آپ کا یہی جواب ہوگا کہ اس سے گھر کی تاریکی دور ہو جائے اندھیرے میں اجالا پیدا کیا جائے۔ لہٰذا اب اسے ماچس کے پاس لانا ہوگا۔ اسے روشن چراغ کے قریب لایا جائے گا۔

بس اسی طرح مرشد برحق، مرید کے دل میں عشق و محبت کا دھاگا تو لگا دیتا ہے مگر جب وہ یہ چاہتا ہے کہ اس میں روشنی پیدا کی جائے تو مرکز نور ہیں روحی فداہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم، تو وہ اس دل کو سرکار کی بارگاہ میں پیش کر کے عرض کرتا ہے یا رسول اللہ! دھاگا لگا دینا میرا کام تھا، روشنی بخشنا آپ کی شان ہے۔ پھر آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم اسے روشن فرماتے ہیں۔

حضرات! اگر موم بتی جلا کر آپ چہار دیواری پر رکھ دیں یا

کھلی ہوئی فصیل وچھت پر، یا آنگن میں رکھ دیں۔ آندھی وطوفان تو درکنار ہوا کا ایک معمولی جھونکا برداشت نہ کر سکے گی۔

لہٰذا معلوم ہوا، اگر اس روشنی کی حفاظت چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ موم بتی روشن رہے، بجھنے نہ پائے تو اسے کسی فانوس میں رکھتے ہیں۔ شیشے کی چہار دیواری سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ تاکہ ہوا شیشے سے ٹکرا کے گذر جائے اور موم بتی کی لو محفوظ رہ جائے۔

حضرات! بس ایسے ہی سرکار دو عالم نے اسے روشن تو فرما دیا مگر جب آقائے دوجہاں کرم فرمانا چاہتے ہیں کہ دل کی روشنی بجھنے نہ پائے یوں ہی برقرار رہے۔ تو پھر وہی دل فانوس الٰہی میں پیش کر دیا جاتا ہے، تاکہ حوادثات روزگار اور خواہشات نفسانی کے تند و تیز جھونکے اسے بجھا نہ سکیں۔

حضرات! اس منزل ارتقاء کو اس طرح درجہ بدرجہ طے کیا جاتا ہے وہ نادان ہیں جو یہ کہتے ہیں "پیری مریدی" کی کیا ضرورت ہے"!

واضح رہے، یہ دولت گرانمایہ محض سجدوں کے سہارے نہیں ملتی تاوقتیکہ کسی مرشد برحق کی ہدایات وعنایات اور توفیق الٰہی، اس کے شریک حال نہ ہو جائے۔ ؎

سرِ مدعمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار
ایں دولت سرمدہمہ کس را ندہند

اسے آپ اس طرح سمجھئے کہ ہمارا اور آپ کا یہ بدن خاکی دو چیزوں سے مرکب ہے ایک بدن، دوم روح۔ بہت سے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ بدن میں توانائی آجائے، بازوؤں میں مچھلیاں نکل آئیں،

پنڈلیاں خوب گسی کسی ہو جائیں تو ایسا شخص گا ماپہلوان کا اکھاڑا ڈھونڈتا ہے۔ اور کچھ ایسے لوگ ہیں جو روح کی غذا اور چارہ کے متلاشی ہوتے ہیں کہ روح میں تازگی اور بالیدگی آجائے تو وہ پہلوان کا اکھاڑہ نہیں بلکہ خواجہ کا آستانہ ڈھونڈا کرتے ہیں۔

معلوم ہوا جسم اکھاڑہ میں سنوارا جاتا ہے اور روح اللہ والے کی چوکھٹ پر سنواری جاتی ہے۔ وصول الی اللہ کے لئے اللہ والے کی چوکھٹ ہی سب سے بڑا وسیلہ بنتی ہے ۔

مور بے کس ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

حضرات! آپ گھبرائیں نہیں میں ابھی آپ کو باور کرانا چاہتا ہوں کہ تصوف و طریقت کی جان، دل کی اصلاح اور اس کی طہارت و پاکیزگی ہے۔ یہ درست تو سب درست، یہ بگڑا تو سب بگڑا۔

حضرات! ایک واقعہ یاد آیا اسے سماعت فرمائیں:

اللہ کے ایک ولی (غالباً حضرت امام کرخی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے) ان کی بزرگی اور زہد و تقویٰ کا بہت شہرہ تھا۔ ایک کمبل پوش درویش ان کی خدمت میں چلے۔ دروازہ پر دیکھا کہ ایک دو نہیں بہت سے قیمتی گھوڑے دروازے پر بندھے ہیں جن کے گلے میں ریشم کی ڈوریاں ہیں اور سونے کے کھونٹے میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی درویش کے دل میں خیال آیا یہ کیسی ولایت ہے جسے دیکھ کر بادشاہ بھی شرما جائے۔ اسے دنیا دار کہا جائے یا اللہ والا بہر حال اس خطرے نے دل میں جگہ بنا لیا۔ کچھ دیر کے بعد مہمانوں کے لئے دسترخوان بچھا۔ یہ درویش بھی شریک ہوئے۔ اسی اثناء میں درویش نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ مدتوں سے دل کی

آرزو تھی اللہ کا گھر دیکھنے کی۔ کاش خانہ کعبہ کی زیارت نصیب ہوتی۔ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ خاموشی سے اسے سنتے رہے جب مہمان کھانے سے فارغ ہوئے تو امام کرخی نے درویش کا ہاتھ تھاما اور ہاتھ پکڑ کر ٹہلنے لگے چند فرلانگ بڑھے حتیٰ کہ بڑھتے بڑھتے کئی میل دور نکل گئے۔ اب درویش سے نہ رہا گیا تو اس نے کہا حضرت کہاں تک چلئے گا۔؟

آپ نے فرمایا ابھی تم یہ کہہ رہے تھے بیت اللہ کی زیارت کا شوق مدتوں سے دامن گیر ہے۔ لہٰذا میں تمہیں ٹہلا نہیں رہا ہوں۔ بلکہ زیارت حرمین کے لئے لے چل رہا ہوں۔

یہ سن کر درویش بولا، چلتے تو ضرور مگر اپنا کمبل اور لوہے کا چھڑ تو آپ کے یہاں چھوڑ آئے ہیں۔ اس پر حضرت امام کرخی نے فرمایا بہت ہی افسوسناک اور حیرت کی بات ہے کہ وہ کمبل اور لوہے کا چھڑ دل میں بیٹھا ہوا ہے جو تمہیں اللہ کے گھر جانے سے روک رہا ہے۔

اے درویش! میرے دروازہ پر تو نے گھوڑوں کو دیکھا ریشم کی ڈوریاں اور سونے کے کھونٹے دیکھے تو تیرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ دنیادار ہے مگر ہمارا، تمہارا فرق یہ ہے کہ تمہارا کمبل اور چھڑ تمہارے دل میں بیٹھا ہوا ہے اور دروازہ پر سونے کے کھونٹے زمین میں گڑے ہیں۔ میرے دل میں نہیں گڑے ہیں۔ یہ یاد الٰہی سے بسا ہوا ہے۔

آپ کو نصیحت کرنی تھی کہ درویشی اس کا نام نہیں کہ بدن کو کمبل اور چھڑ سے سجایا جائے۔ بلکہ فقیری اور درویشی اس کا نام ہے کہ اس دل کو یاد الٰہی سے بسایا جائے۔ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد، خدائے بخشندہ!

اسی لئے اس راہ کے منزل رسیدہ اور دریائے معرفت کے

تبرّک و شناور حضرت سرکار آسی فرماتے ہیں: ؎

ملنے کی یہی راہ، نہ ملنے کی یہی راہ،
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہ گزر ہے

حضرات! ابھی میں اسی حقیقت کو واضح کر رہا ہوں. طریقت کی کائنات اس دل کی صفائی ہے اس کے بغیر یادِ الٰہی کی لذت و چاشنی نہیں مل سکتی۔ میں نے شروع میں آپ سے عرض کیا تھا کہ یہ منصب اعلان کا نہیں۔ بلکہ چھپانے کا ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں سیدی سرکار حضرت مخدوم سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت احمد جام چشتی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا واقعہ "لطائف" میں قلم بند فرمایا ہے۔ یہ خدا رسیدہ اور پائے کے بزرگ، مزدوری ان کا پیشہ اور بظاہر یہی ذریعہ معاش تھا۔ جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر وصیت فرمائی کہ اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ قبر مجھ سے قریب اور میں قبر سے. میری رحلت کا زمانہ قریب آچکا ہے۔ لہٰذا تم لوگ ایسا کرنا، جب میرا وصال ہو جائے تو دیکھو یہ چولھا ہے اور اس پر توا ہے میں نے ہمیشہ اسی پر روٹی پکا کر کھائی ہے۔ لیکن میں نے اس کی کالکھ کو کبھی صاف نہیں کی۔ آج ہی کے لئے چھوڑ رکھی تھی۔ ایسا کرنا اس کی کالکھ میرے منھ میں مل دینا۔ کیوں کہ میں اس قابل نہیں کہ اپنے رب کو یہ گنہگار چہرہ دکھا سکوں اور یہ لوہے کی زنجیر ہے تم لوگ اسی سے میری کمر باندھ کر کھینچتے ہوئے قبرستان لے جانا۔ میں اس قابل کہاں کہ مسلمانوں کے کاندھے پر میرا جنازہ جائے۔

کچھ دنوں بعد حضرت احمد جام چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا اور وہ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ وصال کے بعد لوگوں کو حضرت کی وصیت یاد آئی۔ جناب سیدی سرکار حضرت مخدوم سمنانی علیہ الرحمۃ

والرضوان تحریر فرماتے ہیں کہ ان نادانوں اور حقیقتِ حال سے ناآشنا لوگوں نے وصیت پوری کرنی چاہی بس اتنے میں بہت زور کی ایک کالی آندھی آئی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے اور ہاتفِ غیبی نے آواز دی خبردار! کسی کا ہاتھ میرے محبوب بندہ کی طرف نہ بڑھے ورنہ پوری کائنات سیاہ کر دی جائے گی۔

لوگوں کا کلیجہ کانپا۔ اب انہیں ہوش آیا کہ جسے ہم اپنا ہی جیسا سمجھتے تھے وہ اتنا خدا رسیدہ تھا۔

حضرات! طریقت ایک ایسی پیچیدہ راہ ہے کہ اس کی ریت و رسم ہی الگ اور جدا گانہ ہے۔

خیال تو فرمائیے! اس قدر اپنے کو چھپا کے رکھا کہ قریب سے قریب تر لوگ بھی احمد جام چشتی کو نہ پہچان سکے۔

آج کچھ بھی نہ ہو کر کرامات کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور یہاں سب کچھ ہو کر گدڑی میں لعل کے مانند دنیا سے چل بسے۔

یہی میں نے عرض کیا تھا "یہ منصب ولایت اعلان کا نہیں، چھپانے کا ہے۔ اور یہ لباس کی رنگا رنگی کا نام نہیں بلکہ دل کو علائق دنیا سے پاک و صاف کرنے کا ہے۔

چنانچہ آپ کو اس واقعہ سے بھی بصیرت حاصل ہو گی۔ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جن کی جلالت علم کی ایک دنیا معترف ہے، جب ان پر علم ظاہر کا غرہ تھا تو اپنے اہم معاصرین کے ساتھ بیٹھے ہوئے کچھ علمی مذاکرات اور نکات پر گفتگو فرما رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک صاحب دل درویش قریب آکر بیٹھ گئے۔ اور خاموشی سے ان لوگوں کی باتیں سنتے رہے۔ آخر جب نہ رہا گیا تو فرمایا "ایں چیست" یہ کیا ہے۔ یعنی تم لوگ جو آپس میں گفتگو کر رہے ہو یہ ہے کیا؟

مولانا روم اس بے جا دخل اندازی کو برداشت نہ کرسکے اور جھنجھلا کر بولے "یہ ہمارا قال ہے جس کو تو نہیں جانتا" قال۔ قول سے ہے جس کے معنی گفتگو اور بات چیت کے ہیں۔

بس درویش نے یہ سنتے ہی مولانا روم کی کتاب پانی بھرے حوض میں پھینک دی۔ مولانا روم پر تو غصہ پہلے ہی سے طاری تھا مگر یہ آگ پر پٹرول کا کام کر گیا۔ غصہ میں تمتما اٹھے اور فرمایا، تم نے یہ کیا کیا؟

درویش نے کہا، اگر میں پھینک سکتا ہوں تو کیا تم نکال نہیں سکتے۔؟ جاؤ نکال لو۔ یہ سن کر آگ بگولہ ہوگئے، یا اللہ کس پاگل سے سابقہ پڑ گیا۔؟ لیکن ایک اہل علم ہی کتابوں کی قیمت اور وزن سمجھتا ہے۔ ایک مجاہد تلوار کے سہارے لڑتا ہے، اور عالم اپنی کتابوں کے بل بوتے میدان مناظرہ سر کرتا ہے۔

بہر حال، آگے بڑھے اور حوض میں ہاتھ ڈالا، انگلیاں، ہتھیلی اور کلائی یہ سب حوض کے پانی سے تر بتر ہوگئیں۔ کتاب باہر نکالا لیکن کتاب پلٹا تو کسی ورق، کسی سطر، کسی نقطہ پر پانی کا کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ گویا زمین پر رکھی تھی۔ اسے اٹھا لیا۔

اب مولانا روم کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ اور اسی کیفیت میں سوال کر بیٹھے۔ اے درویش این چیست؟ "اے درویش یہ کیا ہے۔ درویش نے کہا وہ تمہارا قال تھا جس کو میں نہیں جانتا تھا۔ یہ ہمارا حال ہے جس کو تم نہیں جانتے۔

بس اب مولانا کے دل کا دروازہ کھل گیا۔ درویش نے سبقاً سبقاً نہیں پڑھایا، آنکھوں آنکھوں میں پلا دیا۔ چنانچہ اب علم ظاہر کا غلبہ جاتا رہا اور دل کا دروازہ کھلتے ہی معرفت الٰہی کا زینہ مل گیا۔ پھر وہی مولانا روم جو ایک کتاب کے ضائع ہونے پر درویش پر گرجے برسے تھے اب وہی

فرماتے ہیں ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن
آتش نمرود را گل زار کن

اب کتاب ہی نہیں بلکہ فرماتے ہیں پورا کتب خانہ نذر آتش کر دو۔ خدا کو کاغذ کی کتابوں سے نہیں ڈھونڈا جاتا بلکہ اسے دل کی کتاب میں تلاش کیا جاتا ہے۔ جانتے ہو وہ درویش کون تھے حضرت شمس تبریز۔ جن کے متعلق مولانا روم کو کہنا پڑا ؎

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزے نہ شد

ایسے ہی حضرت نیاز بریلوی پر جب باطن کا غلبہ ہوا تو فرماتے ہیں ؎

مکتب عشق میں گئے، درس مقام فنا لیا!!
جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

حضرات! طریقت کی دنیا ہی سب سے الگ تھلگ ہے۔ ان کی مصطلحات جداگانہ ہیں اور تلاش محبوب کے لئے راہوں کے یقین میں ان دشوار گذار گھاٹیوں سے گذرنا پڑتا ہے جو انتہائی کٹھن، حوصلہ شکن اور صبر آزما ہیں۔ بس توفیق الٰہی جس کا ساتھ دیدے وہی منزل سے ہمدوش وہم کنار ہوتا ہے۔ جہاں اس نے اسے اپنا کیا دھرا سمجھا اور اپنی کمائی سمجھی، اور توفیق الٰہی سے رشتہ ٹوٹا بس اس کا بیڑہ غرق ہوا ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

حضرات! ابھی میں نے آپ سے عرض کیا کہ تصوف کی اصطلاحات اور تلاش منزل کی رسم و ریت سب سے الگ تھلگ ہیں۔ اب جی چاہتا ہے

کو تھوڑی بہت اس کی بھی تشریح ہو جائے تاکہ مذکورہ باتوں کا کوئی گوشہ پردۂ تاریکی میں نہ رہ جائے۔

مثلاً شریعت کی اصطلاح میں شرک ایک ایسے پاپ کا نام ہے۔ خدا کے یہاں جس کی معافی نہیں۔ قرآن میں اس کی صراحت ہے۔ شریعت میں اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک ٹھہرانے کا نام شرک ہے اس کی ذات میں کسی کو شریک بنانا شرک فی الذات ہے۔ اور اس کی ایسی صفت میں جو اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہے اس میں کسی بندے کو شریک بنانا شرک فی الصفات ہے۔ مگر بعض صوفیاء اور اہل اللہ کی نظر میں خدا کے وجود کے سوا اور کسی کا بھی وجود ماننا شرک ہے۔

حضرات! نہ تو اسے مبالغہ آمیزی کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی فن کی بازیگری، بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جس کا اعتراف سبھی کرتے ہیں لیکن ہر شخص کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچتی۔ یہ ان کی دوررس نگاہ ہے جس نے بطن در بطن کا سراغ لگا لیا۔

جس طرح "پیاز" کسی کھوکھلی شئی کا نام نہیں ہے بلکہ ہر چھلکے کے بعد چھلکا۔ گویا تہ بہ تہ چھلکا ہے۔ اسی طرح شریعت و طریقت کے بہت سے مسائل تہ بہ تہ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے اسرار و رموز ہیں کہ حجاب اندر حجاب پردہ در پردہ، انھیں کو بطن اور بطون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بطن کے معنی پیٹ۔ چونکہ جو پیٹ میں چیزیں بھری ہوتی ہیں وہ چھپی رہتی ہیں۔ اسی طرح شریعت و طریقت کے ایسے مسائل جو سر اور بھید ہوتے ہیں پردہ در پردہ ہوتے ہیں۔ انھیں بھی بطن و بطون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب جس کی جیسی نگاہ ہوگی ویسے ہی وہ پردہ اٹھاتا چلا جائے گا۔

حضرات! میں نہ جانے کیسے ایک خار دار جھاڑی میں الجھ گیا موضوع سے کچھ لگتی ہوئی بات تھی اس لئے اسے چھو لیا۔ ورنہ یہ خود ایک

ایک مستقل عنوان ہے ۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض صوفیائے کرام فرماتے ہیں خدا کے سوا کسی اور کا وجود ماننا اس کی اصطلاح میں شرک ہے ۔ یہ کوئی محض خانہ ساز اصطلاح نہیں ہے ۔ بلکہ حقائق و معارف پر اس کی بنیاد ہے ۔

اب آیئے اس بحث کو محض فکری و نظری نہ بنا کر مشاہدات کے ساگر میں کھنگالیں ۔ تاکہ مغز اور چھلکے کا صحیح امتیاز ہو سکے ۔

حضرات ! بعض صوفیاء کا یہ فرمانا کہ خدا کے سوا کسی اور کا وجود ماننا شرک ہے ، بظاہر یہ اچنبھے میں ڈال دینے والی بات ہے ۔ اور ایک ایسا نظریہ ہے کہ مرتبۂ اول میں ذہن اس کو قبول کرنے کو آمادہ و تیار نہیں ، لیکن میں آپ کو پہیلی بجھانا نہیں چاہتا بلکہ منشاء یہ ہے کہ مسئلہ کی اصل تصویر بے نقاب ہو جائے تاکہ اس کے تمام خدوخال روشن ہو جائیں

حضرات ! اب اس کو سمجھنا ہے تو ایک مثال سے یوں سمجھئے اب اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہم اور آپ ساحل سمندر پر آجائیں ۔ غالباً آپ سب لوگ ساحل پر پہنچ گئے ہوں گے ۔ ؟

جی ہاں ، جی ہاں ۔

دیکھئے یہ سمندر ہے اس کی بچھی ہوئی روپہلی چادر ہے ، یہ پانی ہے وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی لہریں ہیں ، وہ سینہ تانے ہوئے اٹھتی ہوئی موجیں ہیں ۔ وہ دیکھئے بھنور ہے ، وہ طغیانی ہے ، وہ حباب و بلبلے ہیں شکلیں سب کی جدا گانہ اور نام سب کے الگ الگ ۔ نہر ، موج ، بھنور ، طغیانی ، حباب ۔ مگر اب ایسا کیجئے کہ لہر دکھلائیے پانی نہ ہو ، موج دکھائیے پانی نہ ہو ، طغیانی و بھنور دکھلائیے پانی نہ ہو ، حباب اور بلبلے دکھائیے مگر پانی نہ ہو ۔ بس اب راز سربستہ کھل گیا ۔ آنکھوں کا حجاب ہٹ گیا ذہنوں کے دریچے کھل گئے ۔ فکر کو آگہی ملی ، ذہن کو شعور ملا ، چونکہ اب

مسئلہ فکری و نظری نہ رہ گیا، آنکھ دیکھ رہی ہے، فطرت گدگدا رہی ہے اور وہ مسئلہ جواب تک ہزار ہا تاویلوں میں تھا اب اتنے اجالے میں آ گیا ہے کہ آنکھ دیکھتی جائے اور وجدان قبول کرتا جائے۔

محسوس ہوا کہ لہر، موج، بھنور، طغیانی، حباب، شکلیں الگ الگ مگر پانی کے بغیر ان کا کوئی وجود نہیں۔ ان کا جب بھی وجود ہو گا پانی ہی سے لگا لپٹا ہو گا۔ پانی سے ہٹ کر ان کا کوئی وجود نہیں۔ بس اپنے مسلک وجودی رکھنے والے صوفیاء کا کہنا ہے کہ یہ آسمان اور زمین، چاند تارے ان میں سے کسی کا وجود حقیقی نہیں۔ جس طرح پانی کا وجود اصل ہے اور باقی سب کا غیر اصلی یعنی وجود اصلی کے تابع۔

بس ایسے ہی کائنات کا وجود، وجود اصلی نہیں ہے۔ وجود اصلی صرف وحدہ لاشریک کا ہے اور جملہ موجودات کی ہر شئی اسی کے تابع ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

حضرات! بظاہر بہت ہی کٹھن تھا مگر مشاہدات کی دنیا سے اسے اب بالکل پانی پانی کر دیا۔

کار مشکل بود لیکن برخود آسان کردہ ایم

ایک غلط فہمی کا ازالہ: حضرات! طریقت کسی بے راہ روی کا نام نہیں ہے۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ شریعت کے فکری و عملی آزادی کا دوسرا نام طریقت ہے۔ یہ سراسر نفس کا فریب اور دھوکا ہے۔ دنیا کے بہت ہی اہم اور شریف فن پر ایک اتہام و الزام ہے۔ ڈھونڈتے ہیں جس کی مثال نہ مل سکے۔ اس کے سوا اور کیا کیا جائے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اب اس مقام پر مجھے کہہ لینے دیجئے کہ شریعت کی سب سے کشمن پابندی کا دوسرا نام طریقت ہے۔

ابھی حال ہی میں، میں کرناٹک کے دورہ پر گیا تھا۔ اپنے محترم میزبان، عزت مآب الحاج بڈن صاحب کے یہاں سے ہو کر تنظیم عظمت مصطفےٰ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے دارالعلوم شاہ جماعت ہاسن پہنچا وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں ایک ایسا فرقہ ہے جو دل کی نماز پڑھتا ہے یعنی انھیں نیت، تکبیر، ثنا، قرأت، رکوع، سجود، قیام، قعود کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے ۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی ؛ دیکھ لی

حضرات! اگر ایسے نام نہاد اہل طریقت کو یونہی بے لگام چھوڑ دیا گیا تو اس فن شریف پر جو آنچ آئے گی اس سے ان کا تو کچھ نہ بگڑے گا چونکہ یہ خود ہی بگڑے ہوئے ہیں البتہ اندیشہ ہے کہ ہمارے گوشہ نشین صوفیاء جو اپنے اسلاف سے توکل و قناعت کی امانت لئے تھے اس سے کہیں ان کی پاکیزہ اور مقدس زندگی پر کوئی حرف نہ آ جائے۔ ہمارا بے غبار حریف تو وہ ہے جسے ڈوبتے کو تنکا کا سہارا چاہیئے۔ وہ اسی تاک اور گھات میں رہتا ہے کہ خانقاہی زندگی کو بدنام کرنے کے لئے کہیں سے بھی کوئی ایسا میٹر مل جائے جسے ہتھکنڈا بنایا جا سکے، خواہ وہ نفس پاتھ کا ہی شرک چھاپ صوفی کیوں نہ ہو۔

اسی لئے علماء و صوفیاء دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ علماء اپنی تقریر و تحریر سے اور صوفیاء اپنے کردار و عمل اور خانقاہی وضعداری سے، حریفوں کی ہر سازش کو ناکام بنا دیں۔

سلام و قیام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی حَبِیْبِہِ الَّذِیْ اصْطَفٰی

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

جو شے تری نگاہ سے گذرے درود پڑھو،
ہر جزو کل ہے مظہر انوارِ مصطفےٰ
(علیہ التحیۃ والثنا)

حضرات! ہماری تقریر کا عنوان ہے "درود وسلام" اسی مناسبت سے میں نے قرآن مجید کی اس آیت کی تلاوت کی ہے جسمیں درود وسلام کا تذکرہ ہے۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں "نبی" پر۔ اے ایمان والو تم صلاۃ بھیجو اور سلام بھیجو مصطفےٰ پر۔

حضرات! یہ مفہوم یوں بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ پہلے اللہ تعالےٰ ایمان والوں کو حکم دیتا، کہ اے ایمان والو! صلاۃ وسلام بھیجو میرے مصطفےٰ پر۔ اللہ اور اس کے فرشتے بھی بھیجتے ہیں۔ درود وسلام۔

لیکن قرآن کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے خدا اپنے اور فرشتوں کے بھیجنے کا ذکر فرماتا ہے۔ اور بعد میں ایمان والوں کو حکم دیتا ہے۔

حضرات! یہ واضح رہے کہ قرآن کی ترتیب بے معنی نہیں ہوتی اس کی ترتیب اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے اور قرآن سے ہی سمجھئے۔
مثلاً قرآن کہتا ہے قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔
تم لوگوں میں اللہ کی طرف سے نور آیا اور روشن کتاب۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ تم لوگوں میں روشن کتاب آئی اور اللہ کی طرف سے نور آیا۔ لیکن قرآن نے پہلے نور رکھا اور بعد میں کتاب۔
حضرات! نزول قرآن میں اس کی بہت رعایت ہے کہ اپنی تفہیم میں مزاج انسانی سے بہت قریب ہو۔ ورنہ مقصد ہدایت کے مجروح ہونے کا اندیشہ رہے گا۔
اس معاملے میں انسانی فطرت یہ ہے کہ جب وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو ہاتھ میں پہلے کتاب نہیں لیتا بلکہ روشنی کا اہتمام کرتا ہے بس ایسے ہی قرآن نے پہلے نور کا ذکر کیا اور بعد میں کتاب کا۔ تاکہ آدمی کتاب کی طرف آنے سے پہلے نور مصطفےٰ سے قریب آجائے۔ یہ روشنی ہوگی تب تو قرآن سمجھے گا ورنہ نہیں۔
بہرحال یہ ایک ذیلی اشارہ ہے کہ ترتیب قرآن میں بڑی معنویت ہے۔ اگر آپ اسے ایک مستقل تقریر بنانا چاہیں تو چند آیات اسی طرح کی منتخب کرلیں اور ترتیب قرآن کی معنویت اس کا عنوان بنالیں۔
حضرات! آج کے موضوع کے لئے میں نے آیت درود کی تلاوت کی ہے۔ اس میں پانچ الفاظ ایسے ہیں جب تک آپ اسے نہ سمجھیں گے آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔
اللہ، ملٰئکہ، نبی، صلوٰۃ، سلام۔
اب آپ حضرات ذہن کی حاضری کے ساتھ بیٹھ جائیں تاکہ میں بالترتیب ایک ایک کا مفہوم سمجھا سکوں۔
درسگاہ نظامی کا ابتدائی طالب علم بھی جانتا ہے جس کی نگاہ سے

شرح تہذیب گذری ہوگی کہ اللہ اس ذات واجب الوجود کو کہتے ہیں جو مستجمع ہو جمیع صفات کمالیہ کو۔ یعنی اللہ ایک ایسی ذات ہے جو ہمیشہ سے ہے آج ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اور اس کی جتنی بھی صفات ہیں وہ سب کمال والی ہیں یعنی اس کی کوئی صفت ایسی نہیں جو رذیل اور گھٹیا درجے کی ہو چنانچہ اسلامی مکاتب میں بچوں کو جو کتاب پڑھائی جاتی ہے اس میں بھی بچوں کو یہی پڑھایا جاتا ہے کہ اللہ بے عیب ہے، ہر عیب سے پاک ہے۔

اب اگر ذہن نے اسے قبول کر لیا کہ اللہ، ذات واجب الوجود کو کہتے ہیں اور اس کی جملہ صفات کمال والی ہیں، اس کی کوئی صفات رذیل، کمزور، گھٹیا اور نقص والی نہیں۔ بلکہ تمام صفات اعلیٰ درجے کی کمال والی ہیں۔

تو اب یہیں سے ایک عقیدہ باطل کا از خود بطلان اور رد ہو جاتا ہے۔ بعض نام نہاد کلمہ گو، جن کا دعویٰ ہے کہ خدا کے لئے جھوٹ بولنا ممکن ہے، اب ان سے دریافت کیجیے کہ جھوٹ رذیل اور گھٹیا درجے کی صفت ہے یا اعلیٰ درجے کی؟

حتیٰ کہ جھوٹ عام لوگوں میں بھی ایسا پاپ ہے کہ ایک ایسا جھوٹا جو جنم بھر کا جھوٹا ہو۔ گاؤں، محلہ، پڑوسی اور اپنے بیگانے سبھی اس کو جھوٹا کہیں حتیٰ کہ خود اسے بھی اپنے جھوٹے ہونے کا یقین ہے لیکن ایسے جھوٹے کو اگر آپ جھوٹا کہہ دیں تو مرنے مارنے کو تیار ہو جائے۔

قربان جائیے ایک پرلے درجے کا جھوٹا تو اپنے کو جھوٹا سننا پسند نہ کرے مگر توحید خالص کے اندھے پجاری اپنے خدا ہی کی طرف امکان کذب کی نسبت کر کے اسے جھوٹا کہلوانا چاہتے ہیں۔

حیرت تو یہ ہے کہ انھیں جھوٹا کہو تو آگ بگولہ ہو جائیں اور ان کے خدا کو جھوٹا نہ کہو تو میدان مناظرہ میں کشتی لڑنے کو تیار ہو جائیں۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

لیکن ہر خرد مند و ذی ہوش اسے اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ جن کا خدا جھوٹا ہو سکتا ہے اس کے بندے بھلا کتنے بڑے جھوٹے ہوں گے۔

حضرات! آپ میں سے بھی کچھ حضرات حیرت میں ہوں گے کہ شتاق نظامی ہیں کس بھول بھلیاں کی سیر کرا رہا ہے جس خدا کے بارے میں ہم اس طرح کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتے وہ کیسی گندی ذہنیت کے ہیں، جو خدا کے لئے امکان کذب کے قائل ہیں؟ اور بعض ذہنوں کا یہ چبھتا ہوا کانٹا ہو گا کہ آخر وہ لوگ تو پڑھے لکھے ہیں، وہ ایسا کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟ یا کہا تو کیوں کہا؟

حضرات! اب میں آپ کی بھرپور توجہ چاہتا ہوں۔ ہمہ تن گوش ہو جائیے۔ تاکہ اس فرقے کی ضلالت و گمراہی آپ پر روشن و آشکارا ہو جائے۔

پہلے آپ یہ سمجھ لیں کہ ایک فرقہ ہے "فرقہ زاغیہ" جس کے بعض حضرات نے پہلے یہ کہا کہ "خدا کا جھوٹ بولنا ممکن ہے" اس مسئلہ کو کہا جاتا ہے۔ "امکان کذب باری" پھر اسی فرقہ کے دوسرے حضرات نے کہا "ممکن ہی نہیں ہے بلکہ واقع ہو چکا" اسے کہا جاتا ہے "وقوع کذب باری" یعنی ایک مسئلہ ہے امکان کذب باری اور دوسرا ہے "وقوع کذب باری" اب آپ بالترتیب اسے سماعت فرمانے کی کوشش فرمائیں۔

ا:۔ ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا ممکن ہے اس سلسلہ میں ان کی دلیل یہ ہے کہ کل مقدور العبد مقدور اللہ یعنی جس پر بندہ قادر ہو اس پر اللہ بھی قادر ہے۔ اگر ایسا نہ مانا جائے تو بندے کی قدرت خدا سے بڑھ جائے گی یعنی بندہ تو قدرت رکھتا ہے مگر خدا نہیں۔

اپنے گلے میں پھانسی لگا کے مرجائے؟ یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہوگا، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر قادر نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ جسم سے پاک وصاف ہے۔ اس کے گلا ہی نہیں جسمیں پھانسی لگائے۔ البتہ اگر ہمارے حریف کا ایسا ہی خدا ہو تو اسے مبارک۔

ایسے ہی وہ "حی وقیوم" ہے ہمیشہ سے ہے، آج ہے اور ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس کی موت ہی نہیں وہ تو خالق موت ہے۔ اسی طرح بندہ نہ جانے کن کن باتوں پر قادر ہے۔ اچھلنا، کودنا، دوڑنا، دھوپنا، سوتا اونگھنا، کھانا پینا وغیرہ وغیرہ۔ بندہ ان تمام امور پر قادر ہے تو کیا خدانخواستہ خدا بھی دوڑنے، دھوپنے، اونگھنے، سونے پر قادر ہے؟ نعوذ باللہ من ذالک۔

اس کی تفصیل دیکھنا ہو تو سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی فتاویٰ رضویہ ملاحظہ فرمائیں

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے اس عقیدے کی بنیاد پر ان پر اعتراضات والزامات قائم کئے کہ اگر تم خدا کا جھوٹ بولنا ممکن کہوگے، تو ایک جھوٹ ہی پر کیا موقوف پھر تم جن جن باتوں پر قادر ہو خدا بھی ان سبھوں پر قادر ہوگا اور اسے مثال دے کر یوں سمجھایا کہ پھر اس سے لازم آتا ہے کہ تمہارا خدا، دوڑے، دھوپے، اچھلے، کودے، اونگھے، سوئے وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہ بہروپئے اور اسٹیج کے کلاکار عوام کو دھوکا دیتے ہیں کہ سنیوں کا خدا وہ ہے جو اچھلے، کودے، اور ڈھٹائی کا یہ عالم کہ فتاویٰ رضویہ کو حوالہ میں پیش کرتے ہیں۔

لہٰذا عوام اسے بہت اچھی طرح محفوظ رکھیں کہ ان کا دجل و فریب ہے اور کھلی ہوئی عیاری ومکاری ہے۔ یہ تو توفیق نہ ہوسکی کہ

اپنے گھنونے وگندہ عقیدے سے توبہ کرلیتے اپنے ہی عقیدے کو اپنی طرف نہ منسوب کرکے امام احمد رضا کی طرف منسوب کرکے انھیں بدنام کرنے کی سعی ناکام نے واضح کر دیا کہ یہ ایسا نشیب ہے جہاں پانی مر رہا ہے۔ اس عقیدے کی خرابی وگمراہی ان پر واضح ہے جبھی تو اپنی طرف منسوب نہ کرکے امام احمد رضا کو بدنام کیا جارہا ہے۔ اور اگر اس عقیدے کی طرف سے دلوں میں چور اور کھوٹ نہ ہوتا تو ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہاں ہاں ہمارا یہی عقیدہ ہے۔ عوام کو گمراہ کرنے کے لئے لکھ تو دیا لیکن دارالافتاء نے منھ پر جو کالک لگادی، وہ چھڑائے چھٹ نہیں رہی ہے۔ بعض لوگوں نے تو کھرچنا چاہا۔ صورتیں مسخ ہو کر رہ گئیں مگر کالک نہ گئی۔

حضرات! میں نہ جانے کن کانٹوں میں الجھ گیا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ اللہ ہر شئی پر قادر ہے۔ مگر ممتنعات ومحالات تحت قدرت باری نہیں ہیں۔ ممکن ہے آپ ذہنی خلجان میں مبتلا ہوں کہ بات تو ان کی بھی قرین قیاس اور ذہن سے لگی لپٹی معلوم ہوتی ہے کہ خدا کو ہر شئے پر قادر ہونا چاہیے۔ اب بہت ہی نازک سے نازک تر بات ہے جسے عرض کرنے جارہا ہوں۔ گذارش ہے کہ غفلت میں نہ رہیے بلکہ فلک پیما ذہن کا دروازہ کھول دیجئے۔

حضرات! خدا کا جھوٹ بولنے پر قادر نہ ہونا اس کا نقص نہیں ہے بلکہ غایت درجے کا کمال ہے۔ ہمارا اور اس کا فرق یہ ہے کہ خدا جھوٹ پیدا کرنے پر قادر ہے اور ہم جھوٹ بولنے پر قادر ہیں۔ اللہ کی قدرت کو "قدرت علی الخلق" کہا جاتا ہے۔ اور بندے کی قدرت کو "قدرت علی الفعل" قدرت علی الکسب۔ یعنی وہ سبوح وقدوس جھوٹ پیدا کرنے پر قادر اور ہم جیسے معصیت کیش، عصیاں شعار بندے جھوٹ بولنے پر قادر معلوم ہوا پیدا کرنے کی قدرت بولنے کی قدرت سے کہیں زیادہ بھاری

بھر کم اور باوزن و بالا تر ہے ۔ لہٰذا آپ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھئے کہ خدا کی قدرت معاذ اللہ گھٹ گئی ۔ بلکہ بہت ہی بلند و بالا ہو گئی ۔ جہاں گمراہوں کی نگاہ نہیں جاتی ۔ حق شناسوں کی نگاہ وہاں بھی کام کرتی ہے ۔ حیرت ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر نہ دیکھنے والے دوسروں کی آنکھ کا تنکا تلاش کرتے ہیں ۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک ۔

تصویر کا دوسرا رخ

میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ کسی نے کذب باری کا اقرار کیا ۔ تو بعض لوگوں نے کہا ، امکان نہیں بلکہ جھوٹ واقع ہو چکا ہے ۔ اسے وقوعِ کذب باری کہا جاتا ہے ۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ خدا نے بندوں سے تو یہ فرمایا کہ یہ کرو گے تو یہ سزا ، یہ خطا ۔ تو وہ سزا ، ایسا گناہ ۔ تو ایسی سزا ۔ لیکن کتنے ہیں جن کو معاف کر دیا ۔ آخر یہ جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے ؟ لہٰذا خدا کا جھوٹ بولنا ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہو چکا ہے ۔

حضرات ! اس گمراہی ، کج فکری ، اور کج روی میں مبتلا ہونے کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ اس طبقے نے وعدہ اور وعید کا فرق نہیں سمجھا ۔ وعدہ یہ ہے ، مثلاً آپ بچے سے یہ فرمائیں کہ اگر تم اس بار امتحان میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہو گئے تو پارکر قلم دوں گا ۔ بچہ کامیاب ہو گیا ۔ لہٰذا اخلاقی سطح پر ضروری ہے کہ وعدہ پورا کیا جائے ۔ بچہ کو قلم دے کر وعدہ پورا کیا جاتا ہے ۔ چونکہ سماج ، اخلاق ، معاشرہ بلکہ خود اپنے ضمیر کا تقاضا ہے کہ وعدہ پورا کیا جائے ۔ یہ ہے وعدہ ۔

اور وعید کے معنی ہیں ڈرانے دھمکانے کے ۔ اس میں سزا بھی دی جا سکتی ہے اور معاف بھی کیا جا سکتا ہے ۔

مثلاً اہلسنت کی بلند پایہ مرکزی درسگاہ دارالعلوم غریب نواز الہ آباد کا اصول ہے کہ گیارہ بجے رات تک طلبہ مطالعہ کریں۔ پھر ٹھیک گیارہ بجے دارالعلوم کا صدر دروازہ مقفل کر دیا جائے۔

فرض کر لیجئے کہ پرنسپل کی نگرانی میں چپراسی دروازے میں تالا بند کر رہا ہے۔ اور ایک طالب علم دارالعلوم سے باہر تھا۔ ہانپتا کانپتا حاضر ہوا اور کہا حضور آج کسی وجہ سے پانچ منٹ دیر ہو گئی۔ معاف کر دیجئے اب آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ پرنسپل نے چپراسی کو حکم دیا، گیٹ کھول دو۔ طالب علم اندر ہو گیا اور پرنسپل صاحب نے اسے کہا کہ آج تو میں نے چھوڑ دیا لیکن اب اگر آئندہ تاخیر ہوئی تو اتنی مار پڑے گی کہ سر سے بھیجا نکل آئے گا۔ اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی اسی کا نام اتفاق ہے کہ دوسرے روز وہی طالب علم پھر دارالعلوم سے باہر رہا۔ اور آج دس منٹ کی تاخیر سے چپراسی تالا لگا رہا ہے۔

وہی طالب علم پھر دوڑتا دھوپتا آیا سرکار بھول ہو گئی۔ ایک بہت ہی ضروری کام سے چلا گیا تھا تاخیر ہو گئی۔ آپ ہی ہمارے ماں باپ ہیں۔ ماں کو آپ کے سہارے چھوڑا، باپ کا پیار آپ سے بخشا۔ آپ نہ معاف کریں گے تو کون معاف کرے گا۔؟

پرنسپل صاحب کو ترس آیا سینے میں پتھر نہیں، دل ہی تو ہے چپراسی سے فرمایا، تالا کھول دو۔ بچہ اندر داخل ہو گیا۔ پرنسپل نے فرمایا خبردار! اب آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔

لیکن یہ سہار نپوری طالب علم کہنے لگا حضرت ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ بہت سچے ہیں مگر معلوم ہوا کہ آپ بھی جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ کل ہی آپ نے فرمایا تھا کہ آئندہ اگر ایسی غلطی ہو گئی تو سر سلامت نہ رہے گا نہ کمر۔۔۔ لات گھونسہ تو درکنار پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارا۔ دنیا اس کی عقل پر ہنسے گی

اور اس کا مذاق اڑائے گی۔

ارے نادان ! اسے جھوٹ نہیں کہا جاتا اسے عفو و کرم، عنایت و مہربانی اور شفقت و مروت کہا جاتا ہے۔

معلوم ہوا وعدہ اور وعید کا یہی فرق ہے کہ وعدہ پورا کیا جاتا ہے اور وعید میں چاہے پورا کیا جائے یا معاف کر دیا جائے مگر ان کی الٹی کھوپڑی کا یہ کہنا ہے کہ خدا، بندوں کو جو معاف کرتا ہے تو اس کا جھوٹ ہے۔ گویا یہ کہہ کر انھوں نے خود ہی اپنے اوپر "عفو و کرم" کا دروازہ بند کر لیا تو بھلا اب وہ ایسا کیوں کرنے لگا کہ انھیں معاف بھی کیا جائے اور یہی اس کو جھوٹا بھی کہیں۔ اچھا ہے خوب پٹائی ہو اور ہو گی بھی۔ انشاءاللہ۔

ایک نکتہ

ہمارا کہنا یہ ہے کہ میدانِ محشر میں اگر خدا بندے کو اس کے ہر جرم کی سزا دیدے تو اس کا جلال قہاری و جباری تو نظر آئے گا پھر آخر اسکی شانِ کریمی و رحیمی کہاں ملے گی۔ وہ اگر قہار و جبار ہے۔ تو رحمٰن و رحیم بھی تو ہے ایسے ہی اگر ہر مجرم کو سزائیں دی جائیں تو میرے شفیع محشر کی شانِ شفاعت کہاں نظر آئے گی۔ ہم جیسے سیہ کار تو آس لگائے بیٹھے ہیں، کہ گناہ اگر ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈلوانا چاہے گا تو ان کی "کالی کملی" اپنی پناہ میں لے لیگی۔ تبھی تو ہم کہہ سکیں گے سے

کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمہاری واہ واہ
قرض لیتی ہے گنہ پرہیزگاری ، واہ واہ

حضرات! شاید کہ اس بحث میں ہم نے آپ کا کافی وقت لے لیا۔ اب بہت ہی اختصار سے کام لیتے ہوئے ہیں گفتگو کرنی ہے۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آیت درود میں پانچ الفاظ ایسے ہیں کہ جب

تک اسے اچھی طرح نہ سمجھ لیں گے اس وقت تک آیت کا صحیح مفہوم آپ پر واضح نہ ہو سکے گا۔

ابھی میں نے صرف "اللہ" کی تعریف بتائی ہے اور مجھے امید ہے کہ اس خالص علمی گفتگو کو آپ جیسے دانشوروں نے بخوبی سمجھ لیا ہو گا، جیسے آپ رکوع میں سبحٰن ربی العظیم کہیں اور سجدے میں سبحٰن ربی الاعلیٰ اب ہرگز ہرگز ایسے سبوح قدوس کے لئے نہ تو امکانِ کذب کے قائل ہوں گے اور نہ ہی وقوعِ کذب باری کے۔

فالحمدللہ علیٰ ذالک

(۲)

اب اس کے بعد آیت درود میں "ملائکہ" ہے۔ بیشک اللہ اور اس کے فرشتے صلوٰۃ بھیجتے ہیں، لہٰذا اب آپ کو سمجھنا ہے کہ "ملائکہ" کسے کہتے ہیں۔ ملائکہ کی تعریف یہ ہے کہ جسم نوری یتشکل باشکال مختلفۃ فرشتہ اس جسم نوری کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں بدل سکے۔

حضرت جبرئیل امین تو سید الملائکہ ہیں پھر ان کا کیا کہنا جنکی ڈیوٹی خدا کا پیغام بارگاہِ مصطفےٰ تک پہنچانا ہے۔ اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آیت درود میں لفظ ملائکہ سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

حضرات! یہ آپ نے سمجھ لیا کہ فرشتہ جسم نوری کو کہتے ہیں۔ اس مقام پر اب آپ ایک حدیث کا مفہوم سماعت فرمائیں جسے "حدیث جبرئیل" کہتے ہیں۔

ایک بار آقائے کائنات کی بارگاہ میں آنے والا آیا اور رسولِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گیا۔ اور سوالات شروع کر دیئے۔ یا رسول اللہ۔

ماالایمان یارسول اللہ ایمان کیا ہے؟

ماالاسلام یارسول اللہ اسلام کیا ہے؟

ماالاحسان یارسول اللہ احسان کیا ہے؟

صحابۂ کرام حاضر دربار ہیں وہ دیکھ بھی رہے ہیں اور سن بھی رہے ہیں۔ صحابۂ کرام حیران تھے کہ یہ آنے والا پہچان میں بھی نہیں آرہا ہے اور مسافر و پردیسی بھی نہیں ہے۔ چونکہ چہرے اور لباس پر آثارِ سفر نہیں معلوم ہوتے تھے۔ جب سائل جانے لگا تو آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے صحابہ! کیا تم نے پہچانا یہ کون تھے پھر سرکار نے فرمایا یہ جبرئیل تھے۔

میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جبرئیل فرشِ خاک پر ہیں، زمین ہی پر بیٹھے ہیں، شکل بشر اور لباس بشر میں ہیں۔ خیال فرمائیے پاؤں کا پنجہ بھی ہے، انگلیاں ہیں، اس میں ناخن ہیں، پنڈلی ہے، گھٹنے ہیں، ران ہیں، شکم ہے، سینہ ہے، ہاتھ ہے ہاتھ کی انگلیاں ہیں، ہتھیلی ہے، کلائی ہے، بازو ہے، کندھا ہے، گردن ہے، ٹھڈی ہے، ہونٹ ہیں، دانت ہیں، زبان ہے، رخسار ہے ناک کے اوپر آنکھ ہیں، کان ہے کنپٹی ہے، ابرو ہے، مژگاں ہے پیشانی ہے، سر ہے، سر کے بال ہیں، گویا پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بال تک وہ سب کچھ ہے جو ایک بشر کو ہے۔

اب آپ سب لوگ سنبھل کر جواب دیجئے کہ ٹھیک اس وقت جب جبرئیل امین سید المرسلین کی بارگاہ میں حاضر دربار ہیں خاک پر ہیں شکل بشر اور لباس بشر میں ہیں تو انھیں خاکی کہا جائے گا یا نوری؟ جواب نوری، نوری۔۔۔

حضرات! مجھے کہہ لینے دیجئے کہ سید الملائکہ، خاک پر بیٹھ کر شکل

اور لباس بشر میں نوری سے کیے جا سکتے ہیں تو یہ مصطفیٰ کے خادم ہی تو ہیں۔ پھر جس کے خادم کا یہ حال ہو کہ لباس بشر کا، شکل بشر کی، مگر کہا جائے نوری تو پھر اس کے آقا کو لباس بشر میں ہوتے ہوئے نوری کہتے ہیں تو کیا تکلیف کیا تامل؟ [له] کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

لہٰذا آپ نے درود میں لفظ ملائکہ سے بھی اس کا یقین کر لیا کہ جس کے خدمت گذار کو لباس بشر اور شکل بشر میں ہوتے ہوئے نوری کہا جا سکتا ہے تو آقا کو بدرجۂ اولیٰ کہا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ جبرئیل خاک پر بیٹھے ہیں مگر ان کو خاکی نہیں کہا گیا نوری ہی کہا گیا۔ تو اس سے یہ فلسفہ بھی سمجھ میں آ گیا "خاک پر آنا" اور ہے "خاکی ہونا" اور ہے۔ اسی لئے تو پروردگارِ عالم نے اپنے محبوب کو معراج کی رات عطا فرمائی۔ تاکہ دنیا نے اگر مدینہ کی پاکیزہ گلیوں میں میرے محبوب کو دیکھا ہے تو مقام سدرہ پر بھی دیکھے جہاں جبرئیل نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ اگر بال کی نوک برابر آگے بڑھا تو جل کے خاک ہو جاؤں گا۔ اگر سرکار کو یہی احساس ہوتا کہ جبرئیل جب فرشتہ نوری ہو کر آگے نہیں جا سکتے تو میں معاذ اللہ خاکی ہو کے کیسے چلا جاؤں گا۔

مگر سرکار ہچکے نہیں، ڈرے نہیں، پیشانی پر شکن نہ آئی چہرے کی بشاشت نہ ٹوٹی۔ بڑے ہی طمانیت قلب سے فرمایا کہ جبرئیل تم چلے ہی نہ جاؤ مگر ہم تو چلے۔ پھر اتنی بلندی پر گئے جہاں جبرئیل کا ذہن نہ گیا۔ وہاں سے مرے مصطفیٰ کا گذر گیا۔ اس کی تفصیل واقعہ معراج میں ملاحظہ فرمائیں۔

[له] یہ ایک ایسا ٹکڑا ہے جسے عنوان بنا کر مستقل ایک تقریر کی جا سکتی ہے۔

آیت درود میں ملائکہ کی قید سے اس کا پتہ چل گیا کہ جس کا خدمت گذار لباس بشری میں نوری ہو سکتا ہے تو آقا کیوں نہیں ہو سکتا۔؟

مسئلہ نہیں رہ گیا بلکہ مشاہدے میں آگیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ اس میں کوئی استحالہ نہیں۔ خدا کی قدرت میں ہے کہ لباس بشر کا پہنائے اور حقیقت نور کی بنائے۔ "تقویۃ الایمان" کی شریعت میں اگر قدرت الٰہی کو استحالہ کے ساتھ مانا جا سکتا ہے۔

"اللہ کی قدرت سے بعید نہیں اگر وہ چاہے تو محمد جیسے کروڑوں محمد پیدا کر ڈالے"

حالانکہ یہ محالات سے ہے۔ جب خدا فرما چکا کہ خاتم النبین ہیں ان کے بعد اب نبی نہیں پیدا کروں گا۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ "اللہ کی قدرت سے بعید نہیں۔ اگر وہ چاہے تو محمد جیسے کروڑوں محمد پیدا کر ڈالے"

اے عقل کے اندھو! اللہ اپنے ارادے اور اپنی مشیت کے خلاف چاہے گا کیوں؟

لہٰذا جب اس طرح کے ممتنعات و محالات میں خدا کی قدرت مانی جا سکتی ہے تو پھر اس طرح کے ممکنات میں اللہ کی قدرت کیوں نہیں مانی جا سکتی؟ کہ وہ لباس بشر کا دے اور حقیقت نور کی۔

فالحمد للہ علی ذالک۔

(۳)

نبی: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت درود میں علی النبی فرمایا۔ علی الرسول کیوں نہ فرمایا۔

حضرات! ہم اب تک آپ کو صرف اللہ اور ملائکہ کی تعریف سمجھا سکے۔ اب آیت درود کا تیسرا لفظ ہے نبی۔ ہمارے بہت سے سادہ لوح حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نبی اور رسول میں کوئی

فرق نہیں۔ دونوں ہم معنی ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ رسول اسے کہتے ہیں جو صاحب شریعت جدیدہ ہو جیسے خدا نے نئی کتاب، نیا قانون، نئی شریعت دی ہو۔ اور نبی اسے کہتے ہیں کہ خدا انھیں احکامات کی تبلیغ کے لئے کسی کو منتخب فرمائے۔

لہٰذا رسول خاص ہے، نبی عام ہے۔ یعنی ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی رسول نہیں۔

اس تعریف سے آپ جیسے دانشوروں نے بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا کہ مقام رسالت مقام نبوت سے بلند ہے۔ لہٰذا "آیت درود" میں خدا اور اس کے فرشتے ان کے مقام نبوت پر درود وصلوٰۃ بھیجتے ہیں تو پھر ان کے مقام رسالت کا کیا کہنا۔ ؟ جو کہ مقام نبوت سے بھی بلند و بالا ہے۔

جب نبی اور رسول کی بات آہی گئی ہے تو پھر ایک ضروری مسئلہ اور بھی سمجھ لیں۔

حضرات! ہر نبی و رسول پر ایمان لانا ضروری ہے خواہ اس کے تفصیلات ہمیں معلوم ہوں یا نہ ہوں یعنی نام، گاؤں، شہر، زمانہ، خاندان قبیلہ اسی طرح اور دیگر باتوں کا علم ہو یا نہ ہو کہ ان کا نام کیا تھا، کب آئے کہاں آئے، کس قبیلے میں آئے وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ بات ہمارے عقیدے میں ہو گی کہ خدا نے جتنے بھی نبی و رسول مبعوث فرمائے۔ ان پر ہمارا ایمان ہے۔

اسی لئے آپ نے سنا ہوگا کہ جب محتاط علماء، انبیاء و رسل کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں تو اسمیں کم و بیش کی قید کا اضافہ کر دیتے ہیں یعنی کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل آئے۔ اگر یہ قید نہ لگائی جائے، صرف یہی کہا جائے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل

آئے۔ تو اس میں یہ خرابی لازم آئے گی کہ آپ کی اس متعینہ تعداد سے اگر ایک بھی کم ہو تو گویا آپ نے ایک ایسے کو نبی مانا جو نبی نہیں تھا۔ اور اگر آپ کی متعینہ تعداد سے ایک بھی زاید ہو تو گویا آپ نے ایک ایسے کو نبی نہیں مانا جو اللہ کا نبی تھا۔ ان دو خرابیوں میں سے کوئی نہ کوئی ایک خرابی لازم آئے گی۔ یا تو "غیر نبی" کو نبی ماننا لازم آئے گا۔ یا کسی نبی کی نبوت سے انکار اور یہ بات بالکل واضح رہے کہ غیر نبی کو نبی ماننا بھی کفر ہے۔ اور کسی نبی کی نبوت کا انکار بھی کفر ہے۔ لہٰذا اب سنبھل کر سماعت فرمائیے۔ آج کسی کے علم کا خواہ کتنا ہی چرچا ہو۔ زہد و تقویٰ اور پارسائی کے گن گائے جاتے ہوں۔ اس نے قرآن کا ترجمہ بھی کیا ہو اور پیری مریدی بھی۔

لیکن اگر اس کے مرید و معتقد نے حالت خواب میں اس کو "رسول اللہ" کہا ہو۔ اور حالت بیداری میں بھی اور اس پیر نے اپنے اس مرید سے توبہ نہ کرائی ہو۔ بلکہ معلوم ہونے کے بعد صرف اتنا جواب دیا ہو بعونہ تعالیٰ جس کی طرف تم رجوع کر رہے ہو وہ متبع سنت ہے"۔ تو یہ دونوں کے دونوں مجرم۔ انھیں قاضی کے روبرو شرعی عدالت کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔

چونکہ منصب نبوت "کسبی" نہیں "وہبی" ہے۔ علم و فضل اور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ کی بنیاد پر یہ منصب حاصل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ خدا جسے منتخب فرماتا ہے وہی نبی و رسول ہوتا ہے ؎

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

لہٰذا خدائے قدیر نے "آیت درود" میں "علی النبی" فرما کر یہ اشارہ کر دیا کہ جب ان کے مقام نبوت پر درود بھیجا جا رہا ہے۔ تو انشاء اللہ کران

کے سہارے زندہ ہو گیا تو "معجزہ" ہو گیا۔

ایسے ہی ایک مردہ کی نعش پر رونے والے اکٹھے بیٹھے تھے۔ بیرے سرکار غوث الاعظم یا میرے غریب نواز کا گذر ہوا۔ آپ نے فرمایا اٹھ جا ایسا کیوں ہے؟ یہ سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھو یہاں کام وہی ہے مگر یہاں یہ کہا جائے گا کہ یہ مر تو گیا تھا مگر میرے غوث و خواجہ کی کرامت ہے کہ زندہ ہو گیا۔

دیکھو کام نہیں بدل رہا ہے حقیقت و معنویت میں بھرپور یکسانیت ہے لیکن نسبتیں بدلتی جا رہی ہیں الفاظ بدلتے جا رہے ہیں۔ زندہ ہونے کی نسبت خدا کی طرف کی گئی تو وہاں "قدرت" کہا۔ اسی زندہ ہونے کی نسبت سید عالم کی طرف کی گئی تو وہاں معجزہ کہا گیا۔ اور اسی زندہ ہونے کی نسبت غوث و خواجہ کی طرف کی گئی تو اسے کرامت کہا گیا۔

نوٹ: جوگیوں سے جو خرق عادت افعال صادر ہوتے ہیں اسے "استدراج" کہا جاتا ہے۔ وہ ایک الگ تھلگ شئی ہے وہ اس کا بے جوڑ پیوند بھی نہیں ہو سکتا۔؟

حضرات! یہ وہ مثال ہے کہ الفاظ و شئے ایک جیسی ہے۔ مگر جداگانہ نسبتوں سے الفاظ بدلتے گئے، قدرت، معجزہ، کرامت۔

لیکن "صلوٰۃ" ایسی مثال ہے کہ اس کی نسبتوں کے بدل جانے سے معنی تو بدل جائیں گے لفظ میں تبدیلی نہ آئے گی۔ اب آپ اسے سماعت فرمائیں:

(۱) صلوٰۃ کی نسبت خدا کی طرف کی جائے۔ کہ اللہ نے اپنے محبوب پر صلوٰۃ بھیجا تو اس کے معنی ہیں "نزول رحمت" یعنی اللہ نے اپنے نبی مصطفےٰ پر رحمتیں نازل فرمائیں۔ اور اگر اسی صلوٰۃ کی نسبت ملائکہ کی جب

کی جائے کہ فرشتوں نے رسولِ خدا پر "صلوٰۃ" بھیجا تو اس کے معنی ہیں "استغفار" یعنی طلبِ مغفرت۔ اور اسی صلوٰۃ کی نسبت اگر مومن کی طرف کی جائے یعنی مسلمانوں نے صلوٰۃ بھیجا تو اس کے معنی ہیں درود شریف کے جیسا کہ ہم اور آپ پڑھتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِنِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

دیکھئے یہاں نسبتوں کے بدل جانے سے معنی بدل گئے مگر لفظ وہی رہا

نکتہ:

حضرات! اگر صلوٰۃ کے معنی آپ نے سمجھ لئے تو ایک بہت لطیف نکتہ سماعت فرمائیں:

جب آیتِ درود آپ پر نازل ہوئی تو صحابۂ کرام نے انتہائی ادب سے عرض کیا کہ یارسول اللہ اس آیتِ مبارکہ میں صلوٰۃ اور سلام دونوں کا حکم ہے۔ آپ نے ہمیں سلام کا طریقہ تو ارشاد فرمایا لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ آپ پر "صلوٰۃ" کیسے بھیجی جائے۔؟ آقائے کائنات نے ارشاد فرمایا۔ یوں بھیجا کرو:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِنِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

حضرات! اب آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اللھم صل کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ تو صلوٰۃ بھیج حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر۔

ذرا غور فرمائیے! خدا فرماتا ہے اے ایمان والو! تم صلوٰۃ بھیجو اور جب آقائے دو عالم سے صحابۂ کرام نے دریافت کیا کہ ہم آپ پر صلوٰۃ کیسے بھیجیں تو سرکار نے اس طرح فرمایا: اَللّٰھُمَّ صَلِّ یعنی اے اللہ تو صلوٰۃ بھیج حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

چنانچہ آپ جس قدر بھی درود شریف دیکھیں خواہ وہ چھوٹا ہو یا

پڑھا ہو، درود تاج ہو یا درود لکھی، نماز کا ہو یا غیر نماز کا۔ سب کی ابتدا اَللّٰھُمَّ صَلِّ سے ہے۔ یعنی اے اللہ تو صلوٰۃ بھیج۔

حضرات! قابلِ توجہ ہے یہ مقام۔ پروردگار نے تو نہ جانے کتنے احکام نازل فرمائے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ سبھی کا حکم دیا گیا مگر سرکار نے اس کا طریقہ یہ نہیں سکھایا کہ تم کہو اے اللہ تو نماز پڑھ لے۔ اے اللہ تو ہی روزہ رکھ لے، تو ہی زکوٰۃ دیدے اور تو ہی حج کر لے" یہ جس قدر بھی احکام ہیں ہم اسے خود انجام دیتے ہیں۔

لیکن درود شریف ہی ایک ایسا فعل ہے کہ اس کا حکم ہم کو دیا گیا۔ اور ہم خود خدا ہی سے کہتے ہیں کہ تو جناب رسالت مآب پر صلوٰۃ بھیج۔ اور من مانی نہیں کہتے بلکہ سید عالم کے سکھانے سے کہتے ہیں۔

ارباب حل و عقد اس کا بہت ہی عقیدت مندانہ اور عشق و محبت سے بھرا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ اس میں آقائے دو جہاں کا اشارہ یہ ہے کہ تم اپنی عاجزی کا دامن خدا کی بارگاہ میں پھیلا کر عرض کرو کہ اے پروردگار! تیرے محبوب کی ذات والا صفات اتنی بلند و بالا ہے کہ ہم ان کی بارگاہ کے صلوٰۃ کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اے میرے رب تو ہی صلوٰۃ بھیج حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

شمع شبستانِ رضا کے کندہ شدہ نقوش

نقش	قیمت	نقش	قیمت
نقش برائے انگوٹھی فی نقش	۸/۰۰	نفع تجارت	۳۰/۰۰
۲۴ نقش برائے انگوٹھی مکمل سیٹ	۱۵۰/۰۰	نقش مخمس (اپنی بات منوانے کے لیے)	۴۵/۰۰
۲۴ نقش والی انگوٹھی سادہ	۱۸۰/۰۰	اکسیر اطفال (بچوں کی ضد دور)	۲۵/۰۰
۵ نقش والی انگوٹھی سادہ	۷۵/۰۰	تسخیر جنہ محیط الاسرار	۶۰/۰۰
۵ نقش برائے انگوٹھی روزگار	۴۰/۰۰	شفائے امراض	۴۵/۰۰
چراغ بڑا (دافع آسیب بڑا تم)	۱۵۰/۰۰	اکسیر شکم (پیٹ کی ہر بیماری)	۲۵/۰۰
چراغ درمیانہ (حصول روزگار)	۱۳۰/۰۰	جامع التسخیر	۱۲۰/۰۰
چراغ چھوٹا (برائے صحت بیماری)	۱۲۰/۰۰	وصول قرض	۲۰/۰۰
محبت زن و شوہر	۴۵/۰۰	نقش سیفی (جادو کا اتار)	۲۰/۰۰
نقش مہر نبوت	۳۵/۰۰	تسخیر جن	۳۰/۰۰
نقش دمہ	۱۲/۰۰	چار قل شریف	۳۰/۰۰
تسخیر القلوب تیزی ذہن	۱۵/۰۰	تیر و تفنگ (دشمن کے حملے سے بچاؤ)	۲۵/۰۰
اسم اعظم (ہر کام کے لیے)	۲۵/۰۰	استقرار حمل	۴۰/۰۰
حفاظت حمل	۴۵/۰۰	بری عادت چھوڑنا	۴۵/۰۰
۔۔۔ بڑھانے کے لیے	۳۵/۰۰	سات سلام	۲۵/۰۰
تحفہ نوری نمبر ۱	۱۲۰/۰۰	جامع الکمالات (ہر کام کے لیے)	۲۰/۰۰
تحفہ نوری نمبر ۲ جامع المطلوب	۱۰۰/۰۰	جیب خالی نہ رہے	۴۰/۰۰
دافع دیو پری	۳۰/۰۰	بچہ باآسانی دانت نکالے	۱۵/۰۰
جن آسیب	۳۰/۰۰	کنوارے کنواری کی شادی کے لیے	۴۵/۰۰
نقش سورہ یٰسین	۲۰/۰۰	نقش بسم اللہ	۱۵/۰۰
آیت الکرسی	۲۰/۰۰	اختلاج قلب	۲۰/۰۰
حفاظت جان (بچوں کے لیے)	۱۸/۰۰	اولاد نرینہ	۴۰/۰۰
دافع مرگی	۱۵/۰۰	تحفہ عرب سنہری	۱۲/۰۰
بچہ دودھ پینے لگے	۱۵/۰۰	تحفہ عرب سادہ	۱۰/۰۰
سورۃ اخلاص	۱۸/۰۰	حفاظت از نظر بد (بچوں کے لیے)	۲۰/۰۰

مکتبہ نوریہ رضویہ — ۱۱ — گنج بخش روڈ لاہور فون 213181

روحانی پبلشرز نورانی جامع مسجد مین بازار شام نگر چوبرجی لاہور

اعلیٰ حضرت علامہ الشاہ احمد رضا خانؒ بریلوی و دیگر علماء اہل سنت کے مجرب عملیات و تعویذات کا مستند ذ

تصحیح شدہ مجموعہ

شمع شبستان رضا مکمل

مرتب
علامہ اقبال احمد نوری

تصحیح کنندہ
عبدالعزیز مخدوم چشتی

قبل ازیں بہت سے اداروں نے کتاب ھذا کو شائع کیا مگر کسی نے بھی اس کی صحت لفظی اعرابی، عددی کی طرف توجہ نہ دی۔ ہوتے ہوتے یہ کتاب مجموعہ اعمال وظائف نہ رہا بلکہ مجموعہ اغلاط بن گیا جس کی وجہ سے عاملین و قارئین کا اس پر سے اعتماد اٹھنے لگا۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ روحانی پبلشرز نے تین سال کی محنت شاقہ کے بعد اس کتاب کو اس قابل کر دیا کہ اب اس میں ہر لفظ ہر نقش واضح عربی عبارات اعراب کے ساتھ ہر جملہ غلطی سے پاک اس کی کتابت و تصحیح با وضو کی گئی۔ کتابت کرنے والے بھی عامل، تصحیح کرنے والے حضرات بھی عالم باعمل۔ اب بڑا، درمیانہ اور چھوٹا چراغ، جامع المطلوب، درود شفاء مع آیات شفاء جامع الکمالات، تکسیر جنہ محیط الاسرار، تحفہ نوری نمبر۱، نمبر۲ درود شفا، دورہ مرگی، نقش مخمس، ۱۱۴ سورتوں کے نقوش، نقوش برائے اعضائے جسمانی، باب النجوم، جملہ حروف کے موکل مکتوبی، ملفوظی، ظاہری باطنی، اسمائے جبروت، اسمائے باری تعالیٰ، طبی نسخہ جات جامع التسخیر استخارہ، فالنامہ، خواب نامہ ودیگر تعویذات ایسے ہیں جیسے آپ چاہتے ہیں۔

نوٹ:۔ بڑی محنت سے کتاب کو صحیح کیا گیا ہے پھر بھی کہیں آپ کو کوئی غلطی نظر آئے تو فوراً نشاندہی فرمائیں تاکہ اس کی تصحیح کر دی جائے

عمدہ کاغذ، بہترین جلد، رنگین ٹائٹل، ہدیہ ۷۵/- روپے

ملنے کا پتہ